



تخریج شدہ ایڈیشن

مُسِنِ انسانیت کی سیرت پُمنفرد اسلوب کی خالی ایک جامع کتاب



سیاستِ سیدنا و آپ سیدنا

تألیف

علّامہ شبیل عمانی

علّامہ سید علی ندوی

www.KitaboSunnat.com

مکتبہ سلامیہ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب و سنت ذات کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب

عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔ ←

مجلس التحقیق الاسلامی (Upload) کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ لوڈ

کی جاتی ہیں۔ ←

دعویٰ مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔ ←

☆ تنبیہ ☆

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔ ←

ان کتب کو تجارتی یا مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔ ←

«اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاؤشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں»

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔ ←

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com



مُحْمَّنْ إِنْسَانِيَّةَ كَيْ بِيرِثْ پُونْفِرْدَ اسْلُوبَ كَيْ خَالِلَ اِيكَ جَامِعَ كَاتِبَ

اس حصے کا موضوع بحث ”معاملات“ ہے، نیز اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت، عہد نبوی ﷺ میں نظام حکومت، سلطنت اور ملکیت کی حقیقت جیسے متفرق مضامین و مباحثہ بھی شامل ہیں۔



تألیف

علامہ شبیل نعماںی
علامہ سید نعماں ندوی

مکتبہ علماء

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

کتاب

تألیف

ناشر

اشاعت

قیمت

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل، جہاں مارکیٹ غربی سریز اور بازار لاہور، پاکستان فون: 042-37232369، 042-37244973 فیکر:

شمعت سمیت بینک بالمقابل شیل پیروں پیپ کوتاول روڈ، فیصل آباد، پاکستان فون: 041-2631204، 2034256

E-mail: maktabaislamiapk@gmail.com

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

الحمد لله رب العلمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين
وخاصم النبيين محمد واليه وصحبه أجمعين۔

سیرت البوی خلیفہ اب میں القوامی اسلامی کتب خانہ (جو صدیوں میں سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوة والسلام بلکہ اسلامیات پر مختلف اسلامی مکمل اور وہاں بولی جانے والی زبانوں میں تیار ہوا ہے) کی ایسی متاع گرانیا یہ اور علی شاہکار ہے جس کو کسی تعارف اور کسی مدح و توصیف کی اب ضرورت نہیں، بلکہ اس کی انفرادیت کا اعتراف اور اس سے اپنے تاثر و عقیدت کا اظہار اپنی خوش مذاقی و دیدہ و ری کا ثبوت فراہم کرنے کے مراد ہے:

مادح خورشید مداد خود است

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ انہوں نے سیرت کا دائرة صاحب سیرت علیہ الف الف صلوة کی سیرت طیبہ، حالات و واقعات اور شامل و عادات سے آگے بڑھا کر پیغام محمدی خلیفہ، تعلیمات نبوی اور شریعت اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے، انہوں نے پہلی دو جلدوں کے بعد جن کا اصل ڈھانچہ علامہ شبلی کے قلم ابیاز رقم کا تیار کیا ہوا ہے، دلائل و مجزرات اور منصب نبوت (عقائد، عبادات اور اخلاق) کو بھی اپنی تصنیف کے دائرے میں لے لیا اور ان عنوانات پر چار حصیم جلدیں مرتب فرمائے ہیں کہ بھٹت محمدی خلیفہ اور سیرت نبوی خلیفہ کی وسعت و جامعیت، اس کی بے خطاب ہبری و رہنمائی اور ہر عبد میں حیات انسانی و نسل آدم کے لیے ہدایت و سعادت کے اس سامان کو اس طرح علی انداز میں پیش کیا اور دوسرا نہ مذاہب اور تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا اہتمام کیا کہ یہ کتاب ہر ملک کی ختنی تعلیم یا فتنہ کے لیے رشد و ہدایت کا ایک صحیحہ اور ذات نبوی علی صاحبہا الصلوة والسلام سے گھرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی۔

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ اخلاق کے بعد معاملات و سیاست پر بھی ایک حصیم جلد مرتب کرنے کا تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب سیرت و تعلیمات نبوی خلیفہ پر ایک دائرة المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کا درجہ حاصل کر لیتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس موضوع پر چند مضمایں ہی کے لکھنے کی نوبت آئی تھی اور وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ ان کی کتاب زندگی کا آخری ورق اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے، لیکن انہوں نے

جس پیکانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ کہ اور منصوبہ تھا (جس کا اندازہ اس کے قدمہ ہی سے ہو جاتا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اگر کمکل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلہ سیرت النبی ﷺ کی تکمیل ہو جاتی بلکہ ان کے علمی اور فتنی کمالات و سعیت نظر، جامیعت، اعتدال و توازن، احتیاط و توع، شریعت اسلامی کی روح و مزاج سے آشنا ہی، قدیم و جدید کی واقفیت، دین کے اولین و مستند ترین مأخذ سے نہ صرف براہ راست واقفیت بلکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھنے اور اس علمی و فکری پختگی کی بنابر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہو گی) جو چیز تیار ہوتی اس میں شریعت اسلامی اور تعلیمات نبوی ﷺ کی بہتر سے بہتر نمائندگی اور ترجیحی ہوتی، افراط و تغیریط سے پاک تجد و آزاد خیال کے ہرشاہب سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جود و تنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی اور اس میں ان صد ہا سو الات کا جواب بھی ہوتا جو عصر حاضر کے ذہن اور حالات و مسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے تشنہ جواب رہتے ہیں، اس عبد کے خاص حالات نے اور مغرب میں جو فلسفے وجود میں آئے اور اجتماعیات و سیاسیات کو جو اہمیت حاصل ہوئی (جس کی نظری گزشتہ عبدوں میں نہیں ملتی) اس کے پیش نظر اس کی سخت ضرورت تھی اور یہ وقت کا ایک نہایت ضروری اور انقلاب انگریز کام ہو جاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو حیات مستعار کی تھوڑی فرصت رہ گئی تھی، قلم میں خطبات مدراس اور سیرت النبی ﷺ کی جلد سوم، چہارم، پنجم و ششم کا زور اور آغاز اعلیٰ باقی نہیں رہی تھی، پھر بعض اساب کی بنابردار مصنفوں کی وہ پرسکون فضا اور اس کے وسیع کتب خانہ سے استفادہ کا بہمہ وقت موقع اور فراغ خاطر باتی نہیں رہا تھا اور اس کتاب کا بڑا حصہ غالباً ناسازگار اور ناہموار حالات اور سخت کی غیر مستقل و غیر متعال کیفیت میں لکھا گیا، لیکن ایک بھروسہ ماہر فن اور ایک استاد و کہنہ مشق مصنف کی بات ہی الگ ہوتی ہے، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے اس میں ایک امتیازی شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کے اجمال میں سینکڑوں صفات کا عطر اور اس کے اشارات میں میسیوں کتابوں کا خلاصہ اور حاصل مطالعہ ہوتا ہے، جس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنہوں نے اس موضوع پر میسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہوا اور وہ اس راہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔ عرصہ سے سیرت النبی ﷺ کے مے خانے کے مے خوار اور سید صاحب کی تحریرات و تحقیقات کے عاشق اس بات کے تمنی تھے کہ معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد هفتہ کے لیے جو متفرق مضامین و مباحث تکلیفی ہیں اور سناجاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں، وہ اسی حالت میں کسی طرح زیور طبع سے آ راستہ ہو جاتے تو ان کو پڑھ کر سیرت النبی ﷺ کی چھ جلدوں کے قارئین و عشاق اپنی پیاس بچھاتے اور اپنے قلب و نظر کو روشن کرتے، اللہ کا شکر ہے کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ناظم دار امصنفوں کو دوسری سعادتوں کے ساتھ اس سعادت کے حصول کا بھی

موقع ملا اور انہوں نے ان مضامین کو یک جا کر کے سیرۃ النبی ﷺ جلد ہفتم کے نام سے ایک مجموعہ میں جمع کر دیا، یہ حصہ اگرچہ (سابقہ جلدوں کے مقابلہ میں) خصامت میں بہت کم ہے، لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی ہے اور اس چھوٹی سی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے، وسیع مطالعے کا نجوم اور فکر و نظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی تحریکات میں نہیں ملیں گے، ان کے زمانے کے متعدد مصنفوں اور تحریکوں کے قائد افراط و تفریط میں بنتا ہو گئے ہیں اور انہوں نے مغربی و مادی فلسفوں کا اثر شعوری وغیرہ شعوری طریقے سے قبول کر لیا ہے، اس لیے ان کا قلم اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ ممتاز ہو گیا، اندمازہ ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اس موضوع کی نزاکت اور اس پر قلم اٹھانے کی ذمہ دارہ، کاشدت سے احساس تھا، اس لیے ان کو اس میں عرصہ سُنکِ تر درہ با، مقدمہ میں فرماتے ہیں:

”اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریع ایسے رنگ میں لکھی جائے جس سے نداق حال تسلیم پا سکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نہ ہیں، ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے۔ ان امور کی تشریع میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنा ہو گا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطہ ہے اور خصوصاً اس لیے کہ سیاست و اقتصادیات کے موجودہ موقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات نے علاوہ کتابیں نصاً کثرا خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔“

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

”اس جلد کے لکھنے میں اس بیچ مدان کو سالہا سال پہنچا ہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قلم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹانا پڑا اچنا نچ کام کا آغاز ہے جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ کو کردیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیا، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تھیہ کیا اور پھر رک جانا پڑا، ۲۲ شعبان ۱۳۶۱ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا، لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا، اب کمی رمضان المبارک ۱۳۶۲ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے، مگر انجام عالم الغیب کو معلوم ہے۔“

اس مختصر کتاب میں بھی بعض ایسے اصولی مسائل آگئے ہیں جن سے عام طور پر اس موضوع کی کتابیں خالی ہیں اور اس اجمال کو تفصیل میں لے جانے سے بعض اوقات مستقل تصانیف وجود میں آسکتی ہیں، مثلاً اس کتاب میں ”معاملات“ کی تعریف اس کے اقسام اور ان کی تاریخ خاصی بصیرت افروز اور معلومات افزای ہے ”بیزان“ کی وسیع اور جامع تعریف قرآن کی آیات کے تبعیع اور گہرے مطالعے پر منی ہے۔ سید صاحب

کے قلم سے جو اس کتاب کی تالیف کے دوران سلوک کی ارتقائی منزلیں طے کر رہے ہے تھے (جن کا تھا ضاعام حالات میں نہ صرف جسمانی گوشہ نشینی و انقطاع بلکہ ذہنی عزالت اور وحدتِ مطلب بھی ہوتا ہے) پھر ان کا جس مرکزو ارشاد سے تعلق تھا، وہ نہ صرف سیاست و حکومت کے مسائل سے کنارہ کش تھا، بلکہ اس کو اصلاح و تربیت کے لیے بعض اوقات مضر بھگتا تھا، ایسی صورت میں ان کے قلم سے حکومت کے نعمت ہونے کا تذکرہ تکنا ان کے ذہنی توازن اور اپنی شخصیت کے فکری ممیزیات کو قائم رکھنے کی دلیل ہے، وہ لکھتے ہیں:

”اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت و سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔“

پھر اس کے ثبوت میں قرآن کی آیات بیانات جمع کر دیئے ہیں اور یہ سیرت نبوی ﷺ کے مصنف کا قدیم شہید ہے لیکن پھر ان کا عصری مطالعہ اور اسلامی تحریکیات نے جو لٹر پچ پیدا کیا ہے، اس کی واقفیت ان کا قلم پکڑ لیتا ہے اور ان کے قلم سے حسب ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اس طرح وہ راسخین فی العلم والدین کے مسلک کی پوری ترجمانی کرتے ہیں:

”اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں، جس سے یہ معلوم ہو کہ قیامِ سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقاوہ دوایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لیے بہرہ لہ تہبید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومتِ صالحہ کا قیام ان کے لیے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکامِ الٰہی کی تقلیل با آسانی کر سکیں، اس لیے وہ عرضًا مطلوب ہے۔“

اور اس کی تائید کے لیے وہ سورہ نور کی وہ مشہور آیت نقل کرتے ہیں، جس میں اللہ نے ان مسلمانوں سے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوں اور توحید اور اجتناب عن الشرک کی شرط پوری کرتے ہوں، خلافت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی غریض اور نتیجہ دین مقبول کی پائیداری و استواری اور اس امن و امان کا قیام بیان کیا ہے، جس کے بغیر دین کے احکام اور تقاضوں پر اطمینان سے عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

مصنف کی نظر چونکہ مذاہب سابقہ پر بھی گہری اور وسیع ہے اور جدید فلسفے اور نظام بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں، عیسائیت کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہے جو تفریق دین و سیاست کی قائل تھی اور اس کے متعلق ان کے نامور معاصر اور محبوب دوست اقبال ہنستہ نے صحیح کہا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبا نیت تھی سماں کہاں اس فقیری میں میری خصوصت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سر بلندی ہے یہ سر بزری

اس لیے خطباتِ مدرس اور رسولِ وحدت کے مصنف کے قلم سے بے اختیار اور کسی قدر جوش کے ساتھ یہ عبارت نکل گئی ہے کہ

”اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح اللہ اور قیصر دونبیش، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدوں حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسری، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمران ہے وہی زمین پر فرماں روا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ هُوَ﴾ (الزخرف: ۸۴)

”اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔“ *

چونکہ ان کی مسلمانوں کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر ہے اور انہوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح خلافتِ اسلامی عام دنیاوی حکومت میں تبدیل ہو گئی ہے، نیز وہ موجودہ دور کے قیامِ حکومت کے نزہہ اور اس کے حرکات اور جذبات کو بھی سمجھتے ہیں، اس لیے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

”اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جریہ کا حصول نہ خراج کا وصول ہے، نہ نیمت کی فراوانی نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکا اور نہ شان و شوکت کا تماشا ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیے جدوجہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔“ *

غرض یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود بہت سے فکر انگیز مضامین اور حقائق پر مشتمل ہے، اگر اس میں سیاست اور نظامِ حکومت کا پورا حصہ آ جاتا تو وہ اس عظیم خلا کو بہترین طریقے پر پرکرنی جو جدید اسلامی لڑپرچیر میں پایا جاتا ہے اور جس کی اہمیت کا احساس موجودہ حالات میں غیری فلسفوں کی سحر انگیزی اور اس کے تفوق و قیادت نے اور بڑھادیا ہے، لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنے اثر و وزن میں ”نقش سلیمانی“ ہے اور نقش ہمیشہ مختصر اور اکثر آنکھوں سے مستور ہوتا ہے۔

آثارِ قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگاریوں، متكلّم اسلام اور نابغہ، عصر، استاذ الاسمتدہ علامہ سید سلیمان ندوی بیشنسٹی کی شہرہ آفاق کتاب سیرۃ النبی ﷺ کی کسی جلد پر یہ تکمیل ان پیش لفظ لکھئے، لیکن کسی قدر اس سے تکمیل ہوتی ہے کہ کتاب تکمیل نہیں ہے، اس لیے اس پر ایک ”ناقص“ کا کچھ لکھنا محل تجہب نہیں کہ دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار و یکھر

دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ ۱۹۸۰ء۔ مئی ۲۸۔ ارجب ۱۳۰۰ھ۔ ابو الحسن علی ندوی

* مقدمہ، ص: ۴۹۔ * مقدمہ، ص: ۴۹۔ * اس مضمون میں مقدمہ کے حوالہ سے جو صفات نہ ہوئے گئے ہیں وہ سابقہ ایڈیشن کے ہیں، اس ایڈیشن میں نہیں صفات تبدیل ہو گئے ہیں۔

اُنْهَارِ عَجْزٍ

من و شبها و بیداری و حیرانی و خاموشی!
که محرم نیست خسرو راز باں درگفت گوئے تو

دارِ اصنافینِ عظیم گڑھ
نیچہ دالِ مور سلیمان
سید صباح الدین عبدالرحمن
لے جولائی ۱۹۸۰ء، ۲۳ شعبان المعتظم ۱۴۰۰ھ

شیعہ لفظ الاعین الونیم

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ وَالصَّلٰوٰةُ وَالسَّلٰامُ عَلٰى
سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ وَعَلٰى اللّٰهِ وَاصْحٰبِهِ الطَّاهِرِينَ

مُقَدَّمة

معاملات

ساتویں جلد کا موضوع معاملات
سیرت کی یہ ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کے حدود

معاملات کا اطلاق فقهاء نے حقوق عباد کے ایک خاص حصہ پر کیا ہے۔ مثلاً بعض فقهائے شافعیہ نے احکام شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے، یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے اور یا امور دنیا سے اس کا تعلق ہو گا تو ان کی تین قسمیں ہیں، اگر ان احکام شرعیہ سے جو امور دین کے متعلق ہیں، اشخاص کی بقایا مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں (جیسے خرید و فروخت و اجارہ و رہن وغیرہ) اور اگر خاندان کی بقایا مطلوب ہے تو ان کا نام مناکھات ہے (جیسے نکاح و طلاق و خلع و تفریق وغیرہ) اگر ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقایا ہے تو ان کو عقوبات کہیں گے۔ * (جیسے قصاص و مزادعہ تجزیات وغیرہ)

امام شاطبی نے موافقات کے شروع میں دین کے ضروری احکام کی، جن پر دین و دنیا کی مصلحتیں موقوف ہیں اور جن کے نہ ہونے سے دین و دنیا میں فساد را پائے گا اور انسانی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، قسمیں کی ہیں:

عبادات جیسے نماز روزہ وغیرہ اور عادات جیسے ماکولات، مشروبات، ملبوسات اور مسکونات کے احکام اور تیری چیزیں معاملات ہے، جس سے مقصود نسل نفس اور مال کی حفاظت ہے اور چونچی چیز جنایات ہے جس سے مقصود وہ احکام ہیں جن کا اجر اس شخص پر ہو گا جو احکام بالا کو توڑے (جیسے قصاص و مزادعہ تجزیات)۔

فقہائے احتجاف میں سے علام ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے بحر الرائق کے شروع میں امور دین کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے، اعتقادات، عبادات، معاملات، مزادعہ اور آداب اور ان میں سے معاملات کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ حصہ پانچ ابواب پر منقسم ہے، معاوضات مالیہ (بیع و فروخت وغیرہ) مناکھات (نکاح و طلاق وغیرہ) مخاصمات (آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ) امامات اور تکات (واراثت) اور مزادعہ، یعنی جن کا مous پر شریعت

* کشاف، اصطلاحات الفنون، احمد نہانوی، مطبوعہ کلکتہ، ج ۱، ص: ۲۳ بحوالہ توضیح وتلویح۔

نے زجر کیا ہے اس کی بھی پانچ فتمیں ہیں، قتل نفس پر زجر، کسی کا مال زبردستی لے لیئے پر زجر، کسی کی آبرو ریزی پر زجر، کسی کی پر دہ دری پر زجر، قطع بیضہ (اسلام کا استیصال اور اس سے اخراج) پر زجر۔
معاملات سے ہماری مراد

لیکن ہم نے اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تینوں تعبیروں سے زیادہ وسیع معنی میں کیا ہے، یعنی ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکام شرعیہ ہیں، جن کا تعلق ان تمام حقوقی عبادت سے ہے، جن کی حیثیت قانون کی ہے، جن میں معاملات اور مزادونوں داخل ہیں اور جن کا مفتاح جان و مال و آبرو کی حفاظت ہے، خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی، یا پوری آبادی و مملکت (مدینہ) کی۔ آبادی و مملکت جن کا قانونی نام مدینہ ہے، اس کی حفاظت و مصلحت کے قوانین کا نام سیاست ہے۔ لیکن ہمارے قدیم فقہاء نے اس کے لیے سیر کی اصطلاح قائم کی ہے، جیسے کتاب السیر امام محمد، اس میں امارت و خلافت اور صلح و جنگ کے مسائل آ جاتے ہیں اور متاخرین نے ان کو احکام سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے، جیسے احکام السلطانیہ قاضی ماوردی شافعی المتوفی ۲۵۰ھ اور احکام السلطانیہ قاضی ابویعلى حنبیل المتوفی ۲۵۸ھ، لیکن ان کتابوں میں ضمناً جزیہ و خراج و زکوٰۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آ گئے ہیں اور اسی لیے بعض بزرگوں نے ان مباحث کو الگ کر کے ان کا نام کتاب الاموال، یا کتاب الخراج رکھا ہے، جیسے کتاب الاموال ابو عبید بن سلام المتوفی ۲۲۳ھ اور کتاب الخراج قاضی ابو يوسف المتوفی ۲۸۲ھ اور کتاب الخراج یحییٰ بن آدم القرشی المتوفی ۲۰۳ھ، اہل سنت کے نزدیک گوامت اصول عقائد میں سے نہیں ہے، تاہم اس کے ضروری مباحث کتب عقائد کے خاتمہ میں ذکر کر دیے جاتے ہیں، جن میں امامت کے شرائط اور طریق انتخاب، اس کی ضرورت اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں ان مسائل کی ترتیب اور ان کے بیان کا طرز اگلے بزرگوں کے طرز بیان سے بالکل مختلف ہو گا اور ان کے لیے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کرنی پڑیں گی، اس لیے معاملات کی اس جلد میں قدیم اصطلاحات میں کمی و بیشی اور مباحث میں رو و بدل اور نئی ضرورتوں کے لیے نئے ابواب کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں، جن کا تعلق معاشرت مال و دولت اور حکومت کے صابطوں اور قوانین سے ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تمام اجتماعی کاروبار کے صابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے، جن سے دو یادو سے زیادہ افراد پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریع ہو اور ان صابطوں اور قانون کی تفصیل ہو۔ ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مباحثت کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین فتمیں ہو سکتی ہیں: معاشریات، اقتصادیات اور سیاست اور تینوں کے تحت میں اور بہت

سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں اور انہی تینوں مباحثت کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے، معاشریات میں نکاح و طلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگی، اقتصادیات میں تمام مالی و تجارتی کاروبار کا بیان آجائے گا اور سیاسیات میں حکومت و سلطنت اور اس کے متعلقہ مذکور ہوں گے۔

اس کام کا اشکال

یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف ابواب میں ذکر فرمایا ہے، جن میں یہ احکام مذکور ہیں اور فقهاء نقہ کے متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے، اس لیے ان احکام کو اگر صرف نقہ ہی کر دینا ہوتا تو کام آسان تھا، مگر موجودہ زمانے میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسلیم پائے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا، جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لیے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ موقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدما کی کتابیں نشا اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لیا جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے، مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ کے سیاست کے احکام و فرائض کا ماغذہ خود ذاتِ نبوی علی صاحبہاصلوٰۃ ہے اور حضور انور ﷺ کی تبلیغات کی ذات مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے، جس سے ایک کو درست سے جدا کرنا خن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس بیچ مدارکوں سال پہنچا ہٹ محسوس ہوتی رہی اور پارہاقدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لیتا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز گوئے جمادی الثانی ۱۴۵۲ھ کو کر دیا گیا تھا لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیے، دو سال کے بعد ۱۴۵۲ھ کو پھر لکھنے کا تھیہ کر لیا اور پھر رک جانا پڑا، اب کیم رمضان شعبان ۱۴۵۳ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا۔ لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا۔ اب کیم رمضان المبارک ۱۴۵۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے، مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔ (ریت الشترخی صدری ۸ و یکیزی امری ۹ و احلٌ عُقدَةٌ مَنْ لِسَانِيٌّ يَقْهُو اقْوَلِيٌّ ۱۰) (۲۸/ طہ ۲۵ تا ۲۶)

دیگر مذاہب اور معاملات

دنیا کے مذاہب نے معاملات کو اپنی تعلیم کا حصہ بنانے میں مختلف روحانیات ظاہر کیے ہیں، تورات میں وہ مذہبی قوانین کا ضروری اور اہم جزو ہے لیکن عیسائیت نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہندوستانی مذہبوں میں بھی دونوں تسمیں نظر آتی ہیں، عام ہندوؤں میں منو شاستر اور اس کی مختلف تشریحیں انہی معاملات کی شاخیں ہیں، مگر شاید بودھ مت نے اخلاق ہی کو بڑھا کر قانون بنانے کی کوشش کی ہے، تاہم یہ سب قویں

چلانے میں اس کے چلانے والوں کا دل شریک نہیں ہوتا، اس لیے قدم قدم پر اس کے چلانے والوں کے ذاتی مفادات سے نکلا تا ہے اور بارہا وہ حرص و طمع، غرور تکبیر، ہوا و ہوس، رشوت اور انفجاع ناجائز و خوف و ہراس اور مکروحیت کے بیسوں خلاف انسانیت جذبات سے نکلا کر چور چور ہو جاتا ہے اور عدل و انصاف کی میزان ہاتھ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

قانون الہی کی ضرورت

اسی سب سے مصلحت الہی کا تقاضا یہ تھا کہ عدل و انصاف کی یہ میزان خود دستِ الہی میں ہو، وہ جو کسی فرقہ اور کسی پارٹی میں نہیں، کسی کا ایسا نہیں جو دوسرے کا نہیں، وہ سب کا ہے اور سب کے لیے ہے اور تمام نفسانی اغراض سے پاک و بے نیاز ہے، جس کو اپنے لیے اور اپنی غرض کے لیے کچھ نہیں چاہیے، جس کو دنیا اور اس کی فطرت کا ایک ایک راز معلوم ہے اور جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے آگاہ اور گوشہ گوشہ سے باخبر ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح دنیا میں عرش سے فرش تک اس نے اپنا تکونی فرمان جس کو قانون طبعی کہتے ہیں، جاری کر رکھا ہے، اسی طرح زمین پر اپنا تشریعی فرمان جس کو شریعت کہتے ہیں، جاری فرمائے، جو تمام تر عدل و انصاف پر ہے۔

﴿اللهُ الَّذِي أَنزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْيَمِيزَانَ﴾ (۱۷/الشوری: ۴۲)

”وَاللَّهُ جَسَّ نَحْنُ وَهُنَّا دُوَّلَكَ سَاتِھَا اپنی کتاب (قانون) اتنا ری۔“

﴿وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْيَمِيزَانَ﴾ (۵۷/الحدید: ۲۵)

”اور نبیوں کے ساتھ کتاب (قانون) اور ترازو و اتنا ری۔“

کتاب اور میزان

میزان سے مقصود یہ کامٹھ اور لو ہے کی ترازو نہیں، بلکہ فطرت اور عدل و انصاف اور حق کی میزان ہے جس سے سارا نظام کائنات میں رہا ہے اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تو لے جاتے ہیں، چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ کہ عدل کی میزان میں اونچ نیچ ہے آئے۔

﴿أَلَّا يَرْجِعُنَّ ۖ عَلَمَ الْقُرْآنَ ۖ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۖ عَلَمَهُ الْبِيَانَ ۚ أَلَّا تَمُسُّ وَالْقَمَرُ يُحْسِنَ ۚ

وَالْأَجْمُرُ وَالشَّجَرُ يَعْدِلُنَ ۖ وَالشَّمَاءُ رَفِعَهَا وَوَضَعَهُ الْيَمِيزَانَ ۖ أَلَّا تَكْنُونَ فِي الْيَمِيزَانَ ۖ

وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِنُوا الْيَمِيزَانَ ۖ﴾ (۹۱/الرحمن: ۵۵)

”رحمت والا اللہ جس نے قرآن سکھایا، انسان کو بنایا اور اس کو گویاں سکھائی، سورج اور چاند حساب کے ساتھ ہیں اور بے نئے کے درخت اور نئے دار و رخت اس کے زیر فرمان ہیں اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور اسی نے ترازو (میزان) رکھ دی، تاکہ قول میں کمی بیشی نہ کردا اور قول کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور قول کو گھٹاؤ نہیں۔“

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے، اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تو لے جاتے ہیں، اسی کے اعتدال اور اونچی نسبت کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم، صحیح اور غلط ہے، اس لیے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کائنے پر رکھو۔ ان آئیوں میں انسان کا آفتاب، ماہتاب اور بہات سے پہلے تذکرہ ہے کہ یہ قصد و ارادہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ کے تکوینی فرمان کے تحت طبعی طور سے قصد و ارادہ کے بغیر کس طرح عدل و انصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقرہ طبعی احکام و اصول کے مطابق چل رہی ہیں، اسی طرح قصد و ارادہ کی دولت و نعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہیے کہ وہ ہوائے نفسانی سے فجع کرائے پے قصد و ارادہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام عدل کی پیروی اختیار کرے، قرآن پاک میں بار بار ہے:

﴿وَأَوْفُوا الظَّيْلَ وَالْيِيمَانَ﴾ (۶/الانعام: ۱۵۲)

”اور ناپ اور قول کو پورا کرتے رہو۔“

﴿فَأَوْفُوا الظَّيْلَ وَالْيِيمَانَ﴾ (۷/الاعراف: ۸۵)

”توناپ اور قول کو پورا رکھو۔“

﴿أَوْفُوا الْمَكْيَالَ وَالْيِيمَانَ﴾ (۱۱/ہود: ۸۵)

”ناپ اور قول کو پورا کرو۔“

﴿وَلَا تَنْفَضُوا الْمَكْيَالَ وَالْيِيمَانَ﴾ (۱۱/ہود: ۸۴)

”ناپ اور قول کو گھٹاو نہیں۔“

ان آئیوں میں ناپ اور قول سے معمولی لین دین اور خرید و فروخت کی اشیاء بھی مرادی جا سکتی ہیں اور لی گئی ہیں، لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجئے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں، ہر انسانی ظلم کا ختم یہ ہے کہ انسان اپنے لیے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لیے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے، وہ اپنے لیے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لیے دوسری ترازو سے اس ستم پیشہ پر اللہ کی اور ساری کی پہنکار۔

﴿وَإِنَّ لِلْمُطَفِّفِينَ لِّلَّذِينَ إِذَا أَكَلُوا نَعَّلَ الْتَّائِمِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَانُوْهُمْ أَوْزَأُوْهُمْ ۝

﴿مُخْسِسُوْنَ ۝﴾ (۳۱/المطففين: ۸۳)

”پہنکار ہے ان کم کر دینے والوں پر جو اپنے لیے لوگوں سے ناپ پوری لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کریا تو لکھ کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔“

معاملات انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تشریح ہے، چنانچہ سورہ حمدید میں زمین میں قیام عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں:

• تفسیر طہری میں آیات میزان سورہ حمدید، ج ۲۷، ص ۱۲۲، اور سورہ کرجن، ج ۲۷، ص ۱۲۳۔

»لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا إِلَيْهِنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمَيْزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقُسْطِ«

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعٌ لِلنَّاسِ» (٥٧ / الحديده)

اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو محل نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتنا رہی اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا تارا جس میں سخت بیت ہے اور لوگوں کے لیے کئی فائدے ہیں۔“

اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لیے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، ایک کتاب، یعنی احکام الہی کا مجموعہ، دوسری چیز وہ فطری صحیح و عادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار دل میں دھری ہے اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے اور تیسرا چیز تلوار کی طاقت ہے جو ان دونوں کے مانے پر ان کی گرد نیں جھکا دیتی ہے، یعنی جو احکام الہی کے مانے سے منکر ہیں اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ پکھے ہیں ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے مانے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ آئینہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام حکومت و ریاست ہے اور اس کے دوسرا ہاتھ میں قانون الہی کی کتاب بھی ہونی چاہیے جس کے مانے پر وہ اپنے ماتخواں کو مجبور کرے۔

قانون الہی کی دائیگی یکسانی

قانون الہی کے نظریہ پر ایک شبہ یہ پیش ہوتا ہے کہ دنیا میں حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اس لیے انسانی معاشرت کے خاکے بھی بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے، اس لیے قانون کو بھی بدلتا رہنا چاہیے، مگر یہ خیال سراسر فریب ہے، کیونکہ نہیں بدلتی، اس کے رنگ، شکل اور پہلو بدلتے رہتے ہیں۔ جس طرح مادیات کے اصول طبعی بھی نہیں بدلتے (الا ما شاء اللہ) گرم چیز ہمیشہ گرم رہتی ہے اور سختنڈی، سختنڈی۔ آگ برف نہیں نہیں، بر ف آگ نہیں، روشنی تاریکی روشنی نہیں، زمانہ ہمیشہ بدلتا ہے، رات اور دن پے در پے آتے اور جاتے رہتے ہیں، گھنٹے گھری، پلک اور لمجھ دم بدم بدلتا ہے، سال پر سال آتے ہیں مگر چاند اور سورج وہی ہیں، ان کی چال اور گردش وہی ہے اور ان کے قاعدے اور قانون وہی ہیں، جو طبعی قانون آج سے ہزار برس پہلے آب و گل کی دنیا پر حکمران تھا، آج بھی وہی ہے، اس میں نہ پہلی صدی تغیر پیدا کر سکی، نہ چود، نہیں صدی، پہلے بھی سال کے بارہ سو سی یا تقریبی دوسرے تھے اور اب بھی ہیں، کل بھی دن رات کے چوبیس گھنٹے تھے اور اب بھی ہیں۔ یعنی اللہ کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

»وَلَمْ يَجِدْ لِيُسْتَكِنَ اللَّهَ تَبَدِيلًا« (٤٨ / الفتح)

”اللہ کے قانون میں تو کوئی اول بدلتا نہ پائے گا۔“

فطری حقوق و معاملات کی یکسانی

ٹھیک اسی اصول پر جو اخلاقی و معاشرتی قوانین اور انسانی معاملات کے جو اصول فطری ہیں ان میں نہ

کبھی کوئی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا۔ نیکی بدی نہیں بنتی، بدی نیکی نہیں، حق جھوٹ نہیں ہو جاتا، جھوٹ حق نہیں، ظلم انصاف کا نام نہیں پاتا اور انصاف ظلم کا نہیں، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا، دوسروں کی چیز ناقص لینا، چوری کرنا، ذاکرہ ڈالنا، دوسروں کی عزت و آبرو کو داغ لگانا، دوسروں کے مال کو ناجائز طریق سے لے لینا۔ حق قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف کرنا، کسی کی جائیداد اور ملکیت پر قبضہ کرنا ہمیشہ ناجائز رہا ہے اور رہے گا، لیں دین میں طرفین کی رضا مندی، لڑائی اور جنگوں کے اساب کی روک تھام، اخلاق سوز حركات کی بندش، فتنہ و فساد کا انسداد، خالماں طریقوں کی ممانعت، ہر عہد میں، ہر قانون کی متفقہ دفعہ رہی ہے، جب کبھی کوئی قانون بنتا ہے، یہی فطری دفعات قانون کے ضروری اجزاء، رہے ہیں اور اب بھی جب کبھی بنے گا اس کے یہ اجزاء برقرار رہیں گے۔ البتہ اس کے جزئیات نئے نئے پیش آئیں گے اور نئی نئی شکلوں میں ان کلیات کے فروع سامنے آتے رہیں گے اور ان کے لیے قانونِ الٰہی کے کلیات سے جزئیات اور احکام سے نظائر ہمیشہ نکلتے اور بننے رہیں گے۔

قانون کا بنیادی تجھیل

ہر مجموعہ قانون کا ایک بنیادی تجھیل ہوتا ہے، جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک جزو کی بنیاد ہوتی ہے، یہ بنیاد کہیں تو قوی فوقيت، کہیں وطنی افادیت، کہیں نسلی امتیاز اور کہیں تجاری مفاد قرار پاتی ہے، اس لیے اس مجموعہ قانون میں اسی بنیادی نقطہ غرض کی لیکر یہ ابھری نظر آتی ہیں، جہاں قانون کی بنیاد قوی فوقيت ہے، وہاں کا لے گورے، یورپیں اور نیٹو کے اصول پر کافر مانی ہے، جہاں وطن قانون کی اساس ہے، وہاں جغرافی اقطاع ارضی قانون کے اختلافات کا باعث ہوتے ہیں اور غریبی اور غیر رومی، یونانی اور غیر یونانی، مصری اور غیر مصری، ملکی اور غیر ملکی نژادیات نے انسانی مفاد کے نکٹے کر دیے ہیں، یہی جذبہ آگے بڑھ کر ملک میں بھی صوبہ وار اختلاف کا شیق بوتا ہے، ہندوستانی ہونے کے باوجود پنجابی بنگالی میں اور بنگالی پنجاب میں بیگانہ ہے، بھارتی یوپی میں جگہ نہیں پاسکتا اور یوپی والے پر بھارتی و سمعت تنگ ہے، فیشرم اور نازی ازم میں نسل کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور موجودہ امیریلیزم میں تجاری مفاد کی خاطر قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

قانونِ الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت

اسلام کے قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اطاعت کے لیے زمین سے قند و فساد کا درفع، اس کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام اور معاملات میں لوگوں کے درمیان سے نزاع اور خدع و فریب کی روک تھام ہے۔ ۲۶۰ چنانچہ اسلام کے قانون میں جتنے حدود و تجزیات ہیں ان کا مقصد رز میں سے قند و فساد کا درفع ہے اور جس قدر معاملات و معاشرت کے اصول اور مسائل ہیں، ان کا مبنی

علماء عز الدین بن عبد السلام مصری المتوفی ۲۶۰ھی کتاب توعید الاحکام فی مصالح الامان اور شاه ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب جستہ اللہ البالغہ کے ابواب معاملات ملاحظہ ہوں۔

بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام ہے اور معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں، ان سب کا منشاء بھی نزارع اور خدعاً و فریب کا استیصال ہے۔

اس اور پر کی تفصیل میں آپ نے دیکھا کہ کہیں رنگ اور نسل کا کوئی اختلاف، زبان اور لغت اور تہذیب و تمدن کا کوئی فرق اور ملک و قلمیں کا کوئی امتیاز زیر بحث نہیں آیا ہے، یہ قانون اللہ کا ہے، اللہ کے سارے بندوں کے لیے بنایا گیا ہے، وہ چاہے کا لے ہوں یا گورے، آریائی ہوں یا سامی، یورپی ہوں یا یشیائی، ہندی ہوں یا چڑی، بھجی ہوں یا تاتاری، سب کے لیے یکساں اور سب کے لیے برابر ہیں۔

ایک اصولی فرق

بے شبه ایک فرق اس میں جائز رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت ان کی ہو گی جو اس کے اس قانون کو قانونِ الہی تسلیم کرتے ہیں، اس بنا پر انسانی افراد کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں: ایک وہ جو اس قانون کو قانونِ الہی تسلیم کرتے ہیں، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اللہ واحد و برحق کی طرف سے آخری طور پر آیا ہوا قانون مانتے ہیں، مسلمان ہیں۔ دوسرے وہ جو گواں خاص قانونِ الہی کو نہیں مانتے، لیکن وہ کسی نہ کسی اگلے قانونِ الہی کو خواہ وہ کیسے ہی غیر حفظ ناطق صورت میں اس وقت ہو، مانتے ہیں، ان کا نام ذمی ہے، لیکن ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے پاس مانا ہوا قانونِ الہی اب بھی ان کے مانے ہوئے صحیفہ الہی کے ضمن میں موجود ہے، یہ کتابی ہیں اور دو مدد جو اپنے قانونِ الہی کے صحیفہ کو کھو بیٹھے ہیں، یہ شبہ کتابی ہیں۔ چوتھے وہ ہیں جو سرے سے ہر صحیفہ الہی سے نا آشنا اور ہر قانونِ الہی سے محروم ہیں، ان کو شرک کہتے ہیں۔ اسلامی قانونِ الہی میں ان چاروں کے درمیان بے شبه بعض امتیازات ہیں، جن کی تفصیل اور مصلحتیں اپنی جگہ پر آئیں گی۔

اس تفصیل کے بعد آپ کو اجمالی یا اندازہ ہو گیا ہے کہ معاملات کے حدود کیا ہیں اور اس کی وسعت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں، تاہم اس اجمالی کا ایک ہلاکا ساختا کہ آپ کے سامنے ہم بھی کھیخ دیتے ہیں۔ باہم انسانوں کے درمیان خونگوار تعلقات کے برقرار اور امور معاشرت کی میزان کو درست رکھنے کے لیے ایک عالمانہ طاقت و قوت کا وجود ضروری ہے، جو ہر چیز کو احکام شرع اور نظامِ عدل کے مطابق قائم رکھے، اس بحث کے دو ضروری جزو ہیں۔

۲۱ اس عالمانہ طاقت و قوت کی ضرورت، حقیقت، اس کے شرائط و اوصاف اور اس کے شعبے اور اوارے۔

۲۲ معاملاتِ انسانی کے قسم اور ہر قسم کے علیحدہ علیحدہ احکام اور اس کے اسرار و مصارع۔

اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت

محمد رسول اللہ ﷺ دنیا میں دین اور دنیا دنوں کی برکتیں لے کر آئے، آپ ﷺ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوشخبری نہیں سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی تا کہ دنیا میں اللہ کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف و خطر کی جاسکے اور اس کے لیے اللہ کی بادشاہی اللہ کے قانون کے مطابق دنیا میں فائم فائم ہو:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخِفْهُمُ فِي الْأَرْضِ كَمَا سَتَخَلَّفُ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَمْ لَكُنْتُ لَهُمْ وَيَوْمَ الْيَقْظَى لَهُمْ وَلَيَوْمَ لَهُمْ مِنْ بَعْدِ
خَوْفِهِمْ أَمْنًا طَعْمَدُونَكُنْ لَكَيْشِرُكُونْ لَشِنَّا طَ﴾ (۲۴/ النور: ۵۵)

”اللہ نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا، جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا، جوان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کے واسطے پسند کیا ہے، جمادے گا اور ان کو ان کی اس بے امنی کے بد لے امن دے گا، میری بندگی کریں گے، میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔“

اور اس کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے، تاکہ سارا حکم اسی ایک اللہ کا ہو جائے:

﴿وَقَاتَلُوكُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونُ النَّاسُ مُلْكَةً لِلَّهِ يُلْكِو﴾ (۳۹/ الانفال: ۸)

”اور ان سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فساد نہ ہے اور سب حکم اللہ کا ہو جائے۔“

قرآن نے اللہ کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے:

﴿رَبَّنَا آتَنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ وَقَاتَلَنَا عَذَابُ النَّارِ﴾ (۲۰۱: البقرة)

”اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔“

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے، علم و عبادت، تندرستی روزی، مال و دولت، فتح و نصرت، اولاد صالح، مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی تجدید ہے، دنیا کی بھلائی وہ ہے جو اللہ کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا:

﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَّا إِلَّا خَيْرٌ وَلَيَعْمَدُ دَارُ الْمُتَّقِينَ﴾

(۳۰: النحل)

”اور جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیز گاروں کا گھر کیسا اچھا ہے۔“

مقصود یہ ہے کہ نیکوکاروں کے لیے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے اور آخرت کی بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی، ان کو بشارت ہے:

﴿فَاللَّهُمَّ إِنَّكَ تَوَابُ الدُّنْيَا وَخُسْنَ تَوَابُ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴾

(۱۴۸) آل عمران: ۲/۳

”تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔“

دنیا کا ثواب فتح ولصرت، ناموری و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے۔

جہنوں نے اللہ کی راہ میں اپنا گھر یا چھوڑ اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیل، اللہ نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں جنمیں:

﴿وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا أَنْبُوَتَهُمُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَ جُرُّ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ﴾ (۴۱) النحل: ۱/۶

”اور جہنوں نے گھر چھوڑ اللہ کے لیے ستائے جانے کے بعد، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔“

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سلطوت و حکومت ہے۔

حضرت موسیؑ نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں کی دعائیں:

﴿وَالنُّبُّ لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ﴾ (۷) الاعراف: ۶/۱۵

”اور (اے خدا) ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔“

ان سب آئیوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتادیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائیدار ہے، اس لیے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں، بلکہ غصی ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو، ورنہ اگر دنیا ہی کوئی زندگی کا مقصد بنالیا تو دنیا تو مل جائے گی، مگر آخرت ہاتھہ آئے گی:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَيَنْتَهِيَ تُوفَى إِلَيْهِمْ أَعْمَالُهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُنْجِسُونَ ۝ أُولَئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا تَنَازُّ وَحِيطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَلَيُطِلَّ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝﴾ (۱۱) هود: ۱۵-۱۶

”جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے

ہیں اور کمیں کی جاتی، یہ وہ ہیں جن کے لیے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں اور وہاں جو کہا تمہارے کامی اکارت ہوئی۔“

وَمَا كَهْ فِي الْآخِرَةِ مِنْ تَصْبِيبٍ ﴿٤٢﴾ (الشورى: ٢٠)

”جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ بڑھاتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔“

وَمَنْ يُرِدُ تَوَابَ الْآخِرَةِ نُوَيْتَهُ مِنْهَا وَسَجَّزَى

الشَّكِيرُونَ ﴿٢﴾ آل عمران: ١٤٥

”جہودِ دنیا کا ثواب چاہے گا تو اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا اسکے لئے ہم اس کو دیں گے اور شکرِ گزاروں کو ہم بورا اجر دس گے۔“

● مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لَمْ يُرِيدْ شَيْءًا جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَهَا مَذْمُومًا مَذْحُورًا وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَى لَهَا سَعْيًا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأَوْلَئِكَ كَانُوا يَعْبُدُونَ

(١٧/بني اسراء يل: ١٨-١٩) ﴿مشکوراً﴾

”جو کوئی چاہتا ہو دنیا نے عاجل کو تو ہم جلد دے دیتے ہیں جس کو جو چاہتے ہیں، پھر ہم نے اس کے لیے دوزخ کو بنایا ہے، وہ اس میں داخل ہو گا براہو کر، دھکیلا جا کر اور جو کوئی آخرت چاہے اور اس کی بوری کوشش کرے اور وہ ایمان والا ہو تو ہی ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔“

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ تَوَبَّ الدُّنْيَا فَعِنَّدَ اللَّهِ تَوَابُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ (٤/ النِّسَاءَ: ١٣٤)

”تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو (اس کو معلوم ہو) کہ اللہ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا ثواب ہے۔“

پھر وہ کتنا احمد ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ اللہ کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو تمہارا کا طالب ہے، وہ آخرت سے محروم ہے، لیکن جو آختر کا طلب گا رہے، اس کے لیے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں، لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا تو دنیا تو اس کوں جائے گی، مگر آختر کے ثواب کا دروازہ اس کے لیے بند ہو جائے گا۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے:

﴿فَقَدْ أَتَيْنَا أَلَّا إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَأَتَيْهُمْ مُّلْكًا عَظِيمًا﴾

(٤) / النساء: ٥٤

”تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی اور بڑی سلطنت بخشی۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:

﴿يَقُولُوا ذَكْرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِينَكُمْ آنِيَاءً وَجَعَلَكُمْ مُلُوْكًا﴾

(٥) / المائدۃ: ٢٠

”اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو۔ جب تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے، حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں پوری ہوئی، طالوت کی نسبت خردی لگی:

﴿إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا﴾ (٢/ البقرۃ: ٢٤٧)

”بے شبه اللہ نے طالوت کو تھارا بادشاہ مقرر کیا۔“

لوگ اس پر متعرض ہوئے تو فرمایا:

﴿وَاللَّهُ يُؤْتِ مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ﴾ (٢/ البقرۃ: ٢٤٧)

”اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت دے دے۔“

حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب ہوا:

﴿إِذَا وَدَعْنَا جَعَلْنَا خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ﴾ (٣٨/ ص: ٢٦)

”اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔“

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی:

﴿رَبَّتِ اغْرِيْنِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَسْبَغُ لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي﴾ (٣٨/ ص: ٣٥)

”اے میرے پروردگار! میری مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرم اکہ میرے بعد کسی کو شایان نہ ہو۔“

یعنی کسی انسان کے دینے لینے نہیں ملتی، اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے:

﴿اللَّهُمَّ مَلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِ الْمُلْكَ مَنْ شَاءُ وَتَنْتَزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ شَاءُ﴾

(٣) /آل عمران: ٢٦

”اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔“

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اپنا قاعدہ کلیہ بنادیا ہے:

﴿أَنَّ الْأَرْضَ يَرِيْهَا عِبَادُ الْصَّلِحُونَ إِنَّ فِي هَذَا لِبَّاغًا لِّقَوْمٍ غَيْدِينَ ﴾

(۲۱/الانبیاء: ۱۰۵-۱۰۶)

”بے شک زمین کے مالک میرے صالح بندے ہوتے ہیں۔ اس اعلان میں اللہ کے فرمانبردار لوگوں کے لیے پیام ہے۔“

نعت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَيَسْتَرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ طَإِنَّ اللَّهَ لَغَوْيٌ عَزِيزٌ إِنَّ الَّذِينَ إِنْ مَلَكُوكُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَتُوا الزَّكُوْةَ وَأَمْرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾

(۲۲/الحج: ۴۰-۴۱)

”اور البتہ اللہ اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے، بے شک اللہ بزرگ است قوت والا ہے، وہ کہاگر ہم ان کو زمین میں جمادیں تو وہ نماز کھڑی کریں، زکوٰۃ دیں، اچھے کاموں کو کہیں اور برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔“

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا، وہ پہلے خود اچھا ہو گا اور برے کاموں سے باز رہتا ہو گا۔

اللہ کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے دین حق کی مدد کی جائے، جو لوگ حق کی مدد کے لیے اٹھتے ہیں، اللہ ان کی مدد فرماتا ہے، ان آئتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں اللہ کے قانون کے اجر اکی طاقت ہوئی چاہیے، چنانچہ اسلام میں سارے حدود و تعریفات اسی نفشا کے مطابق ہیں۔ زنا کی حد میں فرمایا:

﴿وَلَا تَأْخُذْ كُمْ بِهِمَا رَأْفَةً فِي دِيْنِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾

(۲۴/النور: ۲)

”اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آئے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔“

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اسے اللہ اور رسول سے لڑائی کے لیے تیار ہونا چاہیے:

﴿فَإِذْنُوا بِحَرْبٍ قَنَّ اللَّهُ وَرَسُولُهُ﴾ (۲/البقرة: ۲۷۹)

”تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول (غُلیشیم) سے لڑنے کے لیے خبردار ہو جاؤ۔“

اس لیے بحران کے عیسائیوں سے آپ ﷺ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا، اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ ۱۰ جو لوگ اسلام کے ملک میں بغاوت کریں، ڈاکہ ذالیں لوٹ مار کریں، قرآن اس کو اللہ اور رسول سے لڑنا کہتا ہے اور اس کی سزا قتل، چھانی، قطع یہداور قید یا جلاوطنی ہے اور ان کی اس بے کسی و بے نی کی کیفیت کو عذاب اور دنیاوی رسائی کہا ہے:

﴿ذلِكَ الْهُمَّ خَزْنٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (۵ / المائدۃ: ۳۳)

”یا ان کے لیے رسائی ہے دنیا میں اور آخرت میں براعذاب ہے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غور میں بنی اسرائیل پر مظالم کے پھاڑ توڑنے شروع کیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی:

﴿إِنَّمَا يَنْهَا عَنِ اللَّهِ وَأَصْبِرُوا إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُرِيكُمْ مَمَّا مَنَّ اللَّهُ بِهِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُمْكِنِينَ﴾ (۷ / الاعراف: ۱۲۸)

”اللہ سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔ زمین تو اللہ کی ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس کا مالک بنا دیتا ہے اور آخر بھلا توڑنے والوں کا ہے۔“

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلی پر جو درحقیقت پیشیں گوئی کی بشارت تھی، اتنا اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا:

﴿عَلَى رَبِّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوّكُمْ وَيُسْتَحْلِكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيُنْظَرُ كُلُّ فَقِيمَاتٍ﴾

(۱۲۹ / الاعراف)

”قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔“

آخر جب وعدہ الہی کے پورا ہونے کا وقت آیا تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی وہی غلام اور بے کس قوم خلافتِ الہی کے تاج سے سرفراز ہوئی:

﴿وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يَسْتَعْفِفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي لَمْ يُرَكِّنَا فِيهَا طَوَّافًا وَسَمَّتْ كُلَّمَةً رِيلَكَ الْحُسْنَى عَلَى بَيْتِنَا إِسْرَاعِيلَةَ لِيَمَا صَدَّرَوْا﴾ (۷ / الاعراف: ۱۳۷)

”اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور سمجھی جاتی تھی اس زمین کے پورب اور پچھم کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے برکت دی ہے اور اللہ کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی ان کے صبر کی وجہ سے۔“

﴿ابوداؤد، کتاب الخراج والفيء والا مارة، باب فی اخذ الجزية: ۴۱ - ۳۰﴾

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی، لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے ماننے سے منہ پھیرنے لگے، تو دفعۃ العزت کا یتاج ان کے سر سے اتر گیا، اللہ نے پیشین گوئی فرمائی:

﴿وَقَضَيْنَا إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لِتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَتَّبَيْنَ وَلَتَعْلَمَنَّ عَلَوْا كَيْرَاءَهُ فَإِذَا جَاءَهُ وَعْدُ أُولَئِمَا بَعْنَاهُ عَلَيْنَمْ عِبَادَةَ إِنَّا أَوْلَى بِأُلْئِمْ شَدِيدٌ فَيَسْأُوا جَهَنَّمَ الَّذِي يَأْكُلُ وَكَانَ وَعْدًا مَفْعُولًا ۚ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرْبَةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاهُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَيْنَنَّ وَجَعَلْنَاهُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۖ إِنْ أَخْسَنْتُمْ أَخْسَنْتُمْ لَا نَفِيكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْنَمْ فَلَهَا ۖ فَإِذَا جَاءَهُ وَعْدُ الْآخِرَةِ لَيْسَوْءُ أَوْ جُوهَرَهُمْ وَلَيَدْخُلُوا الْمَسِيْحَدَ كَمَا دَخَلُوا أَوَّلَ مَرَّةً وَلَيُتَبَرَّوْا مَا عَلَوْا تَبَرَّيْهَا ۚ﴾

(۱۷) بنی اسرائیل: ۷-۴

”اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبر دار کر دیا تھا کہ تم دفعہ دو زمین میں فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے تو جب ان میں سے پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے ان پر اپنے بڑے بخت بندوں کو بھیجا تو وہ ملک میں گھس گئے اور اللہ کا وعدہ ہو کر رہتا ہے، پھر ہم نے ان پر تم کو پھیرا اور تم کو مال اور اولاد سے مدد کی اور تمہاری تعداد بڑھائی اور کہہ دیا کہ اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے لیے اور برا کرو گے تو اپنا، پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو اوروں کو تم پر ابھارا، تاکہ تمہارے منہ بگاڑ دیں اور بیت المقدس میں ویسے ہی گھس جائیں، جیسے (تمہارے پہلے دشمن) پہلی دفعہ اس میں گھس گئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کر دیں۔“

اہل خبر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اغراض سے بیان کیے گئے ہیں، وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لیے وہ عبرت کا سبق بنتیں اور انہیں معلوم ہو کہ اگر وہ بھی اللہ کے عبید کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی اللہ کا وہی برداشت ہو گا۔ اوپر کی آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی تو انہیں پہلے ہی ہوشیار کر دیا گیا تھا کہ یہ خلافت و سلطنت اسی وقت تک ہے جب تک احکام اللہ کی پرروی کی جائے۔ جب تم ان سے منہ پھیرو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منہ پھیر لے گی، چنانچہ اسلام سے پہلے یہودیوں کی تاریخ میں یہ دونوں موقعے پیش آئے اور دفعہ دو ان کی شامت اعمال سے بیت المقدس کو پاہل اور ان کو ذلیل و حکوم ہونا پڑا۔ ایک بابل کے بادشاہ ہو کر دنر مردوف بہ بخت نصر کے ہاتھوں اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کے بعد دو میوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ مذہبی سلطنت کا م实事求是 جانا، ظالم بادشاہ کے بیٹوں میں گرفتار ہوتا اور دوسروں کی مخلوقی جو خود ہمارے ہی برے اعمال کا تبیح ہوتی ہے، دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غیظ و غصب کا سبب ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی آمد کے موقع پر ان کو آخری مہلت دی گئی، چنانچہ اوپر کی آیتوں کے بعد ہی ارشاد ہوا:

﴿عَسَى رَبُّكُمْ أَنْ يَعْلَمُمْ وَإِنْ عُذْتُمْ عُذْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكُفَّارِ حَصِيرًا إِنْ هُنَّ إِلَّا قُرْآنٌ يَهْدِي لِلّّٰقِي هُنَّ أَقْوَمٌ وَيُبَيِّنُ الْوَعْيَنِ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۹-۸)

”امید ہے کہ تمہارا پروگرام پر حرم کرے گا اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کرو گے تو ہم بھی وہی (پہلا ساسلوک) کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنارکھا ہے، یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں، بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے اجر عظیم ہے۔“

یہ رحمت کی امید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی ﷺ پر ایمان لا میں، لیکن وہ جب اس سے محروم رہے تو رحمت الہی بھی دور ہو گئی، کیونکہ انہیں سنادیا گیا:

﴿أَوْلُوا الْعَمَدِ أُوفِيَ بِعَهْدِ كُلِّهِ﴾ (۴۰/ البقرة: ۲)

”تم میرا وعدہ پورا کر تو میں تمہارا وعدہ پورا کرو گا۔“

بقہرہ کوئی ۱۰ میں اسی بیانِ الہی کی بار بار یاد دلائی گئی ہے:

﴿وَإِذَا حَدَّنَا مِيقَاتٍ بَيْنَ أَسْرَاءِ عِيلٍ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهُ وَإِلَّا الَّذِينَ احْسَنُوا وَذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالسَّكِينَ وَقُوْلُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَقَيْمُوا الصَّلَاةَ وَأُولُو الْرَّكُونَ طَمَّرَتْ لَهُمُ الْأَقْلِيلَا مِنْكُمْ وَأَنَّمَّ مُعْرِضُونَ وَإِذَا حَدَّنَا مِيقَاتٍ لَا سَقِيفُونَ دَمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَبْنَاهُمْ وَأَنَّمَّ تَشَهُّدُونَ ثُمَّ أَنَّمَّ هُؤُلَاءِ تَقْتَلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظَاهِرُونَ عَلَيْهِمْ بِإِلَيْهِمْ وَالْعُدُوِّا يَنْ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ مِّنْ أَسْرَى تُقْدِرُوهُمْ وَهُوَ عَزَّزَمْ عَلَيْكُمْ أَخْرَاجُهُمْ طَأْقُوْمُونَ بِعَيْنِ الْكَثِيبِ وَلَكُفُّرُونَ بِعَيْنِ﴾

(۸۳-۸۵/ البقرة: ۲)

”اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور قیمیوں اور محتاجوں کے ساتھ بھائی کرتے رہنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہنا، تو چند شخصوں کے سوا تم سب (اس عہد سے) منہ پھر بیٹھے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا اور اپنے کو ان کے دھن سے نہ نکالنا، تو تم نے اقرار کر لیا اور تم (اس بات کے) گواہ ہو، پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو اور اپنے میں سے بعض لوگوں پر گناہ اور ظلم سے چڑھائی کر کے انہیں دھن سے نکال بھی

دیتے ہو، اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدل دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو، حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم کو حرام تھا (یہ) کیا (بات) کہم کتاب (اللہ) کے بعض احکام کو مانتے ہوا وہ بعض سے انکار کیے دیتے ہو۔“

لیکن ان کے اس عہد کو ہمیشہ کے لیے بھلا دینے پر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ہمیشہ کے لیے بھلا دیا اور فرمایا:

﴿فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَقْعُلُ ذَلِكَ مِنْكُمُ الْأَخْرَىٰ فِي الدُّنْيَاٰ وَيَوْمَ الْقِيَمَةِ يُرْدُونَ إِلَى أَشَدِ الْعَذَابِ﴾ (۲/ البقرة: ۸۵)

”تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں توسوائی ہوا اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیجے جائیں۔“

مسجدوں کی ویرانی اور خصوصیاتیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل کتاب کو یہ زمانی گئی:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ نَعَمَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُدْكِرْ فِيهَا أُسْمَهُ وَسَعَ فيَ حَرَابِهَا أَمْ أَوْلَئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا حَافِظِينَ هَلْهُمْ فِي الدُّنْيَاٰ خَرُّىٰ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾

(۲/ البقرة: ۱۱۴)

”اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے، جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام کا ذکر کیے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو، ان لوگوں کو کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں، مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لیے دنیا میں رسول رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔“

جو لوگ اللہ اور رسول ﷺ سے لڑتے ہوں اور اللہ کی زمین میں فساد اور غارت گری پھیلاتے ہوں، ان کے لیے دنیا کی سزا میں بھی مقرر کی گئیں اور کہا گیا کہ ان کو مارڈا الاجائے، ان کو سولیوں پر لکھا جائے، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں، ان کو ملک سے باہر قید کر دیا جائے:

﴿ذَلِكَ لَهُمْ خَرُّىٰ فِي الدُّنْيَاٰ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (۵/ المائدۃ: ۳۳)

”یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا (بھاری) عذاب (تیار ہے۔“

یہود کے رئیسون اور عالموں کو جنہوں نے کتاب الٰہی کو چھوڑ کر اپنے رسوم و عادات کو اپنی شریعت بنالیا تھا، یہ زمانی گئی:

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَاٰ خَرُّىٰ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (۵/ المائدۃ: ۴۱)

”دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔“

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب و دلیل کے بغیر اپنے اوہام اور باطل خیالات کی بنا پر دین میں کج بھتی کرتے

ہیں اور دنیا کی جاہ و دولت کے غرور میں حق کی راہ سے مند پھیرتے ہیں، ان کے لیے بھی آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کی روائی بھی ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٌ مُّبِينٌ ثُمَّ أَعْطَهُمْ لِيُضْلِلُ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَكُمْ فِي الدُّنْيَا خُزْنٌ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَمةِ عَذَابَ الْحَرَقِ﴾
﴿لِيُضْلِلُ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَكُمْ فِي الدُّنْيَا خُزْنٌ وَنُذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَمةِ عَذَابَ الْحَرَقِ﴾

(الحج: ٦٧/ ٢٢)

”اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی شان میں بغیر علم (و داش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روش کے جھگڑتا ہے اور (تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے، تاکہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے گراہ کر دے، اس کے لیے دنیا میں ذلت ہے اور قیامت کے دن ہم اسے عذاب (آتش سوزان) کا مزہ چکھائیں گے۔“

یہود نے جب گائے کے پھرے کے پھرے کے بنا کر پوچھا تو موسیٰ علیہ السلام کو وحی الہی نے خبر دار کر دیا:
﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيِّئَاتُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذَلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذِلِكَ
مَجْزُئِي الْمُفْتَنِينَ﴾ (الاعراف: ١٥٢/ ٧)

”(اللہ نے فرمایا) جن لوگوں نے پھرے کے پھرے کو (معبدوں) بنالیا ان پر پروردگار کاغضب واقع ہو گا اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہو گی) اور ہم افترا پروازوں کو ایسا ہی بدله دیا کرتے ہیں۔“

یہی نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لیے ذلت، قومی مسکنت اور غضب الہی کے مستوجب تھہرائے گئے، کیونکہ انہوں نے احکام الہی سے اخراج کیا، اللہ کے رسولوں کو قتل کرتے اور حسد ویالہی کو توڑتے رہے:

﴿وَصُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْذِلَّةُ وَالْمُسْلَدَةُ وَبَأْعَوْهُ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ذَلِكَ بِإِنَّهُمْ كَانُوا يَكُفُرُونَ
بِأَيْمَانِ اللَّهِ وَيَقْتَلُونَ الشَّيَّئَنَ بِغَيْرِ الْحِقْقَةِ ذَلِكَ بِإِنَّهُمْ كَانُوا يَعْتَدُونَ﴾

(البقرة: ٦١/ ٢)

”اور (آخر کار) ذلت (اور رسولی) اور محتاجی (اوے نوائی) ان سے چندا دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے، یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آئیوں سے انکار کرتے تھے اور اس کے نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے (یعنی) یہ اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔“

آخر الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمدان کے لیے مہلات کا آخری موقع تھا، لیکن ان کی سرکشی بدستور قائم رہی، اس پر اللہ نے قیامت تک کے لیے ذلت و مسکنت اور غیروں کی غلامی ان کی قسمت میں لکھ دی:

﴿صُرِيْتُ عَلَيْهِمُ الدِّلْلَةُ اَيْنِمَا تُقْعِدُوا لَا يَجْبِلُ قَنَ اللَّوْ وَحْبِلُ قَنَ النَّاِسِ وَبَأْعَوْ يَغْضَبُ
قَنَ اللَّوْ وَصُرِيْتُ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ طَذْلَكَ يَا تَهْمَمَ كَانُوا يَكْفُرُونَ يَا يَتَهْمَمُ اللَّوْ وَيَقْتَلُونَ
الْاَنْبِيَاَءَ يَغْيِرُ حَقًّ طَذْلَكَ يِهَا عَصَوَاَ كَانُوا يَعْتَدُونَ ﴾ (۲/آل عمران: ۱۱۲)

”یہ جہاں نظر آئیں گے، ذلت (کو دیکھو گے کہ) ان سے چھٹ رہی ہے، بجز اس کے کہ یہ اللہ اور (مسلمان) لوگوں کی پناہ میں آ جائیں اور یہ لوگ اللہ کے غصب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے، یا اس لیے کہ اللہ کی آئیوں سے انکار کرتے تھے (اور اس کے) پیغمبروں کو نا حق قتل کرو یتے یا اس لیے کہ یہاں فرمائی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔“

دوسری سورہ میں ہے:

﴿وَإِذْ نَأَذَنَ رَبِّكَ لَيَعْتَذِنَ عَلَيْهِمُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ مَنْ يَسْوُمُهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ طَإِنَّ رَبَّكَ
لَسَرِيْعُ الْعَقَابِ هَ وَإِنَّهُ لِغُورٌ حَمِيمٌ ﴾ (۷/الاعراف: ۱۶۷)

”اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے اشخاص کو مسلط رکھے گا جو ان کو بری تکلیفیں دیتے رہیں، بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔“

یہود کی پوری تاریخ شروع سے آج تک قرآن پاک کی اس صداقت پر گواہ ہے، تاریخ کا کون سا دور ہے، جب ظالم باوشا ہوں اور وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہاتھوں انہوں نے اپنے کی سر انہیں پائی ہے اور آج بھی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہمارے مفسروں نے اس دنیاوی عذاب، ذلت، نکبت اور مسکنت کی تفسیر جزیہ سے، یعنی ان کی دامنی بخوبی اور غلامی سے کی ہے، قرآن پاک کی دعائیں ہے:

﴿اللَّهُمَّ مِلْكُ الْمُلْكَ تُؤْتِنِ الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْتَزِعُ الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتُعَزِّزُ مَنْ تَشَاءُ
وَتُنْذِلُ مَنْ تَشَاءُ طَبِيْرِيَّكَ الْخَيْرِ طَ ﴾ (۳/آل عمران: ۲۶)

”اے اللہ! سلطنت کے مالک اتو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔ تیرے ہاتھ میں سارا خیر ہے۔“

ان آئیوں میں لف و نشر مرتب ہے، یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت فرمایا گیا ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر جو کچھ ہو رہا ہے اور ہو گا اس کا تعلق یہود کی نسل و قومیت سے نہیں، بلکہ ان کے افعال و کردار سے ہے، احکام الہی سے اخراج، انہیا و مصلحین امت کا قتل

و تکذیب، حرص و طمع، سودخواری اور تمام دیگر ذمائم و قبایع جن کی تفصیلات مذکور ہیں، وہ اس کے ذمہ دار ہیں کہ وزیر مین کی وراشت اور اللہ کی خلافت کے رتبہ سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیے گئے، پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ أَخْذُوا الْعِيلَ سَيِّئَ الْهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَاٰٖ وَكَذَلِكَ

﴿تَجْزِيَ الْمُفْتَرِينَ﴾ (۷/الاعراف: ۱۵۲)

”(اللہ نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنا لیا تھا، ان پر پروردگار کا غصب واقع ہو

گا اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) ہم افتخار پر وازوں کو ایسا ہی بدله دیا کرتے ہیں۔“

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچھڑے کے بچھڑے کے بچھڑے کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر اس مفتری کے لیے ہے جو تو حید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی جگہ سامنی کرے گا اور ارض و سما کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی تلاش و طلب میں در بدر بھرے گا، مگر عزت کا سر ما یہ اس کو با تھنڈائے گا:

﴿وَمَنْ يُبَعِّدَ اللَّهُ فَهُوَ الَّهُ مَنْ مُكْبِرُهُ﴾ (۲۲/الحج: ۱۸)

”اور جس کو (اس کے اعمال کے پاداش میں) اللہ رسوی کرے اس کو عزت دینے والا کوئی نہیں۔“

عزیزیے کہ از در گہش سر بتافت بہ پر در کہ شد ہیچ عزت نیافت
اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے، اس کی بندگی اس کے احکام کو بہ
دل و جان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا
ذریعہ ہے اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں طہانیت و برکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔
اللہ تعالیٰ کے احکام کو بہ دل و جان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شرع میں ایمان اور ان کے مطابق
کام کرنے کا نام عمل صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی بخشی ہے اور اسی طاقت سے
آسمان اور زمین سے برکت کا مینہ برستا اور فتوحات کا چشمہ ابتا ہے، اللہ نے یہود و نصاریٰ سے خطاب کر کے
فرمایا:

﴿وَلَوْاَنَّ أَهْلَ الْكِتَبِ أَمْنُوا وَأَنْقَوْا لَكَفَرُنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا دُخْلُنُهُمْ جَنَّاتُ التَّعْيِيْنِ وَلَا وَلَوْ
أَهْمُمْ أَفَأُمُوا الشَّوَّرِيَّةَ وَالْأَنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَا كَفُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمَنْ

تَحْتَ أَرْجُلِهِمْ﴾ (۵/المائدۃ: ۶۵-۶۶)

”اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محور دیتے
اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ توراۃ و انجیل کو اور جو (اور کتابیں) ان کے
پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئیں، ان کو قائم رکھتے تو (ان پر رزق مینہ کی طرح برستا

ک) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔
لیکن افسوس کہ انہوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا، تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسرا نافرمان قوموں کو دی گئی تھی:

﴿وَلَوْاَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ أَمْنُوا وَأَتَقْوَا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بِرَبْكَتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَكُنْ كَذَّبُوكُمْ فَأَخْذَنَنَّهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (۹۶/۱۷) (الاعراف)

”اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیز گار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے، مگر انہوں نے تو تکذیب کی، سوان کے اعمال کی سزا میں، ہم نے ان کو پکڑ لیا۔“

پھر خاص مسلمانوں سی بطور وعدہ کے فرمایا گیا:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّلِحَاتِ لَيَسْتَخِفْفَهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۴۵/۲۴) (النور)

”جو لوگ ان میں سی ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔“

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَعَدَ اللَّهُ مَعَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَلَ لَكُمْ هَذِهِ﴾ (۴۸/۲۰) (الفتح)

”اللہ نے تم سے بہت سے غنیموں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، سواس نے غنیمت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی۔“

مجاہدین امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عرصی دنوں کی باہشاہی تمہارے ہی لیے ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هُنَّ أَذْلَّكُمْ عَلَىٰ تَجَارِيَةٍ تُؤْجِيُّكُمْ مِّنْ عَذَابِ أَلِيُّوٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَجَاهِدُهُوْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِ وَأَنْفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ لَكُنْتُمْ تَعْلَمُونَ يَعْفُرُ لَكُمْ ذُنُوبُكُمْ وَيُدْلِلُكُمْ جَنَاحُ تَحْرِيٍ مِنْ تَحْوِيَّتِهَا الْأَنْهَرُ وَمَسِكِنَ طَيْبَةٍ فِي جَنَّتِ عَدْنٍ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ وَأُخْرَى تُجْهِيُّهَا نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ وَبَيْرِ المُؤْمِنِينَ﴾ (۶۱/۱۰-۱۳) (الصف)

”مومونو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذابِ الیم سے مخلص دے (وہ یہ کہ) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا اور اللہ کی راہ میں اپنے ماں اور اپنی جان سے جہاد کرو، اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغِ ہائے جنت میں جن میں

نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشت ہائے جاودا میں (تیار) ہیں، داخل کرے گا، یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے ہیں (یعنی تھیں) اللہ کی طرف سے مد نصیب ہوگی اور فتح عقریب ہوگی اور مونوں کو اس کی خوشخبری سنادو۔“

یہ فتح و نصرت اسی دنیا میں ملنے والی تھی، جس کا مقدمہ امام القزوینی مکہ معظمہ کی فتح تھی اور اس کی امباہ ساری دنیا میں اسلام کی سر بلندی اور دینِ الہی کی ہر دین پر فوکیت اور غلبہ:

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ إِلَيْهُمْ وَإِنَّ الْحَقَّ لِيُظَهِرَهُ كَمَا أَنَّ الَّذِينَ كُفَّارٌ﴾

(التوبۃ: ۳۳)

”وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تاکہ اس دین کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے۔“

یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورہ فتح و سورہ صاف میں دہرائی گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تو ہے اور فتح والی پیشین گوئی کفار کے اور سورہ صاف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے۔ یہ پیشین گوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرا رنگ میں آئینہ پوری ہونا ہے اور یہ مسلمانوں کی جمیع اور اٹھیناں کا باعث ہے، لیکن اس کے پورے ہونے کے لیے مسلمانوں پر سعی و کوش بھی فرض ہے، بدروغیہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی گوئی مجرم صادر غایلہ کی طرف سے دی جا چکی تھی، تاہم مسلمانوں کو اس کے لیے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی، جیسا کہ سورہ فتح کی پیشین گوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے:

﴿وَقَاتَلُوكُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونُنَّ فِتْنَةً وَيَكُونُ الَّذِينَ كُلُّهُمْ يُلْلَهُو﴾ (الانفال: ۳۹)

”اور لوگوں سے لڑنے رہو، یہاں تک کہ فتنہ یعنی نفر کا فساد باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔“

سارا حکم اللہ کے لیے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی اطاعت اور فرمابرداری کے سوادنیا میں کسی روحانی و جسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے، جس کی بھی اطاعت ہو وہ اللہ کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کہ وہ بھی اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح و نصرت اور حصول غنیمت کی بشارة دی گئی ہے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے، دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا يَعْوَنُكُمْ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ الْسَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَنَّا يَعْلَمُمْ فَتَحَمَّلُ قَرِيبًا وَمَغَانِيمَ كَثِيرًا يَأْخُذُونَهَا وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا وَعَدَ اللَّهُ مَعَانِيمَ كَثِيرًا تَأْخُذُونَهَا فَتَجْعَلُ لَكُمْ هَذِهِ

وَأُخْرَى لَهُ تَقْدِيرُ وَاعْيَهَا فَذَلِكَ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا

(٤٨/الفتح: ١٨-٢٠)

”(اے پیغمبر ﷺ! جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ ان سے خوش ہوا اور جو صدق و خلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا، تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی، بہت سی شخصیتیں جوانہوں نے حاصل کیں اور اللہ غالب حکمت والا ہے، اللہ نے تم سے بہت سی شخصیوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، تو اس نے غنیمت کی تھمارے لیے جلدی فرمائی..... اور شخصیتیں بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے اور وہ اللہ ہی کی قدرت میں تھیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

یہ فتح و غنیمت جس کے بھلکت پانے کی خبر اس آیت میں ہے، وہ خبر کی فتح ہے، جو بیعت رضوان کے فوراً ہی بعد حاصل ہوئی اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے، وہ مکہ کی فتح ہے، چنانچہ اسی سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوش خبری مسلمانوں کو سامنہ نواز ہوئی:

﴿إِنَّا فَكَحْنَاكَ فَتَحَّا مُؤْمِنًا﴾ (٤٨/الفتح: ١)

”(اے محمد ﷺ! ہم نے تم کو فتح دی، فتح بھی صریح اور صاف۔“

آنحضرت ﷺ جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے پکھے اور خانہ کعبہ کے ساتھ سارا عرب بھی بت پرسی کی نجاست سے پاک ہو چکا، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس فتح و نصرت کے وعدے کے پورے ہونے کے بعد عالم آختر کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا:

﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا۝ فَسِيمُهُمْ مُّحَمَّدٌ رَّسُولُهُ وَاسْتَغْفِرُهُمْ۝﴾ (١١٠/النصر: ٣-١)

”جب اللہ کی مدد اور فتح آپکی اور تم نے دیکھا کہ لوگ اللہ کے دین میں گروہ درگروہ داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت چاہو۔“

اسلام کی دعوت، شرک کی تردید اور تو حیدر کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، طاعات اور عبادات کی دعوت، فرائض و حقوق کی ادائی، قلوب و نفوس کی صفائی اور اخلاقی کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم و تربیت تدریج کے ساتھ تکمیل کو پہنچتی گئی، ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہنچتی گئی اس موقع پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں، جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لیے بمزلم تہبید تھے، بلکہ جو

کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرعاً اور حقوق فرائض ہی اصل مطلوب ہیں اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لیے وجہطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکام الہی کی تعمیل با آسانی کر سکیں، اس لیے وہ عرضًا مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجیح ہے:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفُوهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفُ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي أَرَتَنَاهُ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ
خَوْفِهِمْ أَمْنًا طَبَرِيُّ يَعْبُدُونَكُنْ لَا يُشَرِّكُونَ بِنِ شَيْعَاطٍ﴾ (۲۴ / النور: ۵۵)

”جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مشکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کوشش کے نہ بنا سکیں گے۔“

اس آیت میں خلافت کے عطا، خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو، اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادت الہی کی تعلیم اور در شرک کی دعوت اس لیے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا اسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے۔ اس کی مسجد اس کا دیوان، اس کا نمبر اس کا تخت تھا، اسلام کے جن بدگان دشمنوں نے یہ سمجھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی، جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگ جو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپ ﷺ نے پہلی کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی، ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے نآشنائی پر مبنی ہے، ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رہیں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برانہ کہیں، لیکن آپ ﷺ نے ان کی اس درخواست کو بھیٹھے مکار دیا۔ ﴿کیونکہ آپ ﷺ کی دعوت کا مقصد محمد رسول اللہ ﷺ کی انسانی پادشاہی نہ تھی، بلکہ روئے زمین پر اللہ واحد و بحق کی بادشاہی کا قیام تھا، اسی لیے اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی پادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح اللہ اور قیصر دونہیں ہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسری اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جا رکی ہے، وہی آسمان پر حکمران ہے اور وہی زمین پر فرماں روں ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهٌ﴾ (۴۳ / الزخرف: ۸۴)

سیرۃ ابن حشام فدرؤسائے قریش کی گفتگو، ص: ۱۸۱، ۱۸۰ مطبوعہ محمد علی صبیح مصر۔

”اور وہ ہی ہے جو آسمان میں اللہ ہے اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔“
وہ دیویوں اور دیوتاؤں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے
کے لیے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین، دونوں میں ایک ہی اللہ کی حکومت ہوگی،
اس کے آسمان میں نہ کوئی دیوی ہوگی، نہ دیوتا ہوگا اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسری، جو اس دعوت
کی راہ کار روڑا بنے گا، اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لیے تکوار اٹھائے گا وہ تکوار سے گرایا
جائے گا، سورہ مزمل کے آخر میں جو آغاز وحی کے زمانہ کی سورہ ہے، ﴿ مُسْلِمُوْنَ کو ہوشیار کیا جاتا ہے :
﴿ وَأَخْرُونَ يَغْرِيْنَ فِي الْأَرْضِ يَتَّغَوُّنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَأَخْرُونَ يُقَاتَلُوْنَ فِي سَيِّلٍ

اللّٰہۖ﴾ (۷۳/المزمول: ۲۰)

”(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی کی علاش میں اور
وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی راہ میں لڑنے چلیں گے۔“

یہ جنگ کی پیشین گوئی اس زمانے میں سنائی جا رہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے
پیغام کو تبغیث و سنان کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئے گی، کویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم
تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور و رونکے کی کوشش کریں گے اور آخر مسلمانوں
کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سریکف میدان میں آتا ہوگا۔

کہہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے
آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی، سنوایے میرے سچتھجے! اس شیء دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و
دولت ہے تو ہم تمہارے لیے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ اور اگر تمہیں
اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے اور
اگر تمہیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اس کے جواب میں حضور ﷺ نے سورہ
فصلت کی آیتیں پڑھیں، جن کو سنتے ہی عتبہ حیرت میں آ گیا اور واپس آ کر قریش سے کہا کہ اللہ کی قسم!
محمد ﷺ جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ شاعری ہے، نہ جادو ہے اور نہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں، قریشی بھائیو!

میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے ان کے منہ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا، اس لیے تم محمد ﷺ کو اپنا
کام کرنے دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ گئے تو ان کی بادشاہی تمہاری ہی بادشاہی اور ان کی عزت
تمہاری ہی عزت ہوگی اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے، تمہیں انگلی ہلانے کی بھی ضرورت
نہ ہوگی، لیکن رئیسوں نے یہ کہہ کر کہ محمد ﷺ نے عتبہ پر بھی جادو کر دیا، اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کر

● بعض روایات میں ہے کہ اس سورہ کے اوپر اور آخر میں ایک سال کا فصل ہے، صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین،
باب جامع صلوٰۃ اللّٰلیل: ۱۷۳۹: ویہقی و حاکم واحمد۔

دیا۔ کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس دفعہ سب نے مل کر آنحضرت ﷺ کی خدمت القدس میں عرض کی:

”اے محمد ﷺ! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہو گا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو، جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے۔ تم باپ دادوں کو برآ کپتھے ہو، ہمارے مدھب میں عیب نکالتے ہو، ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو، تم نے ایک تی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈال دیا، تو اگر اس کام سے تمہارا مقصد دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ذہیر لگادیتے ہیں، کہم ہم سب میں دولت مند بن جاؤ اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانے لیتے ہیں اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بننا لیتے ہیں اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا اعلاج کرائیں گے۔“

یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں، مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہیے، نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے، مجھے تو اللہ نے رسول بننا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے اور مجھے اللہ سے حکم ملا ہے کہ اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کروں، اگر تم اس کو مان لو گے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہو گا اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا، یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ کا فیصلہ آجائے۔“ ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام کا مقصد روم و ایران اور جیرہ و غسان کی طرح کی شخصی یا قومی شان و مشوکت کی بادشاہی نہ تھی، جو صلح و آشتی سے آسانی سے قائم ہو سکتی تھی، اس لیے قریش کی قومی بادشاہی یا حجاز کی طرفی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا، لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی، یہ دنیا کی اصلاح عالم کا اخلاقی و سیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا، جس کی وسعت میں دین و دنیا کی ہر چیز آجائی تھی اور اسی لیے اس کے لیے عرب و جنم بلکہ جن و بشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔ قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابوطالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد ﷺ سے صلح ہو جائے، ابوطالب بھیجے سے کہتے تھے: جان عم! یہ قریش کے سردار آئے ہیں، وہ کچھ شرط تم سے لینا چاہتے ہیں اور وہ کچھ تم کو دینا چاہتے ہیں، ارشاد ہوا: ”اے عم بزرگوار! میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے وہ عرب کے بادشاہ ہو جائیں گے اور جنم ان کے زیر نگیں ہو گا۔“ ابو جہل نے کہا: ہم آپ ﷺ کی ایک بات نہیں دس با تین مانیں گے، ارشاد فرمایا کہ ”یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں اور اللہ کے سوا جن کو پوچھتے ہو ان سے دست بردار ہو جاؤ۔“ حج کے موسم میں آنحضرت ﷺ عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر تو حیدر کی

دعوت دیتے ہیں اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں: ”اے لوگو! کہو کہ اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں، تم فلاج پاؤ گے، عرب تھہاری بادشاہی میں ہو گا اور تمہارے تابع فرمان ہو گا اور تم جنت میں بادشاہ ہو گے۔“ *
 بیعت عقبہ میں جب مکہ والوں کے ذریعے مکہ کی ایک گھانی میں رات کو چھپ کر رسول انام ﷺ کے دست مبارک پر چند گنٹی کے نفوس جو مدنیہ سے آئے تھے، بیعت کر رہے تھے تو انصار میں سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور فراست سے کہا کہ یہ کسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے، اسعد بن زرارہ انصاری ﷺ نے حضور ﷺ کے حضور ﷺ کے دست مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا: لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ ﷺ سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ تم عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے اس کے لیے لڑنے کو تیار ہو؟ سب نے کہا: ہاں۔ انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اب آپ ﷺ اپنی شرطیں پیش فرمائیں، ارشاد ہوا: ”اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور نماز کھڑی کرو گے، زکوٰۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے اور جو جس کام کا اہل ہو گا اس کو اس سے چھیننے کے لیے جھگڑا نہ کرو گے اور جس سے تم اپنی اور اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہو، میری بھی کرو گے۔“ انصار نے ایک آواز سے کہا، ہاں! یا رسول اللہ! آپ ﷺ کی یہ سب باتیں منظور، لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا: ”جنت اور فتح و نصرت۔“ **

یہ گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمہ دعوت دین و دنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے بیجام کو لے کر نکلا ہے، دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی اور آختر تلوار کو تلوار سے گرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام کو قائم کرنے کے لیے عرب و عجم بلکہ جن و بشر میں سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا اس کو قوت سے تو زنا پڑے گا، یہاں تک کہ اللہ کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز شمنوں سے محصور تھی، مختلف موقعوں پر صحابہ ﷺ کو بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی خوش خبریاں دیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضور ﷺ کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا، انہیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوہ احزاب میں جو بحربت کے چوتھے سال پیش آیا، مٹھی بھر مسلمان جو مدنیہ کی کھلی آبادی میں تھے، حملہ آور عربوں کے زخمی میں گھر رہے ہیں، دم بدم خبریں آ رہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متعدد طاقت سے سیلاپ کی طرح مدینہ پر امنہ تا چلا آ رہا ہے، آنحضرت ﷺ اور جان ثار صحابہ ﷺ بھوکے بیانے

* طبقات ابن سعد، ج ۱، ص: ۱۴۵، لا یذن۔

** طبقات ابن سعد، جزء ثالث بذریں قسم ثانی، ص: ۱۳۹ لا یذن۔

مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں کہ ایک بھاری پتھر سامنے آ جاتا ہے، جس کو مسلمانوں کے پھاؤڑے اور کدالیں راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہی ہیں، حضور ﷺ تشریف لاتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر ضرب میں چنگاری لکھتی ہے جس کی روشنی میں پہلے کسری کے شہر، پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ جہش کے شہر نظر آتے ہیں اور حضور ﷺ ہر دفعہ بلداً واز سے فرماتے ہیں، اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سر و سامانی کے ساتھ ہوا، اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چند نہ ہتے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوں میں چند ہی سال بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر و کسری کے تحت المٹ دیں گے، لیکن مخبر صادق علیہ اصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ "مسلمانوں! تم قسطنطینیہ فتح کرو گے۔ مایں تمہارے ہاتھ آئے گا، قیصر و کسری کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے، مصر کا تخت تم کو ملے گا، تم سے اور ترکوں سے جن کی آنکھیں چھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے، جنگ ہوگی، ہندوستان تمہاری فوجوں کا میدان جہاد اور بحر روم تمہارے ہنگی جہازوں کا جولان گا، بنے گا، بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی۔"

لیکن ان خوش خبریوں، بشارتوں اور پیشیں گوئوں کے ہجوم میں یہ بات بھولانہ چاہیے کہ یہ حکومت، یہ بادشاہی، یہ تخت، یہ تاج، یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں، یہ اس لیے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے موقع کو دور کرنے میں متعین ہیں اور اسلام کے حدود اور قانون عدل و انصاف کے اجراء کے ذریعے ہیں، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں، خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، دوسرا بات یہ ہے کہ اس قوت و طاقت، شان و شوکت اور مال و دولت کو صرف اللہ کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے، اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت، یہ عیش و عشرت، یہ دولت و حشمت اور جاہ و مال، سوئے مال کا موجب ہو جائے گا، اسی لیے ضروری ہے کہ کوفر سے جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لوگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت و حشمت اور مال و دولت دنیا کی نہیں، بلکہ صرف آخرت کی آرائش کے لیے ہے، دنیا آخرت کی کھنچتی ہے، یہ کھنچت دنیا کے لیے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی اور اگر آخرت کے لیے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لیے فوز و فلاح کا موجب ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَذَلَكَ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا أُنْوَهَ مِنْهَا

وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ تَقْسِيمٍ﴾ (۴۲/ الشوری)

"جو شخص آخرت کی کھنچت کا خواتینگار ہو، اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور جو دنیا کی کھنچت کا

ان واقعات کے حوالے سیرۃ النبی ﷺ جلد سوم میں پیشیں گوئوں کے بیان میں ہے۔

خواستگار ہو، اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہو گا۔
 «وَمَنْ يُرِدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدُ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَجْزٍ يَوْمَ الْشَّكَرِينَ ۝» (۱۴: ۳) (آل عمران: ۱۴)

”اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم تینیں بدل دے دیں گے اور جو آخرت میں طالب ثواب ہو، اس کو وہاں اجر عطا کریں گے اور ہم شکرگزاروں کو عنقریب بہت اچھا صلدے دیں گے۔“

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہوشیار کیا گیا ہے کہ دولت فانی کے پیچھے دولت باقی کو مت بھولو، کیونکہ یہاں کی لذت، عیش و عشرت، آرام و راحت اور دولت و سلطنت آخرت کے لذائذ، ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں بیچ ہیں:

«وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا أَنْبُوَتَهُمُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَاتٌ وَلَا جُرُوا إِلَى الْآخِرَةِ أَكْبَرُهُمْ ۝» (۱۶/ التحلیل: ۴۱)

”اور جن لوگوں نے ظلم سنبھنے کے بعد اللہ کے لیے وطن چھوڑا، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔“

جو لوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل بحثتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا:

«أَرَضِيْتُمُ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ۝»

(التوبہ: ۲۸)

”کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت میں بہت معمولی ہے۔“

«وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَزِيَّتُهَا وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَّأَنْفُلٌ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝» (۲۸/ القصص: ۶۰)

”اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو اللہ کے پاس ہے، وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے، کیا تم نہیں بحثتے۔“

«بَلْ تُؤْتِيْوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ خَيْرٌ وَّأَنْفُلٌ ۝» (۸۷/ الاعلیٰ: ۱۶-۱۷)

”مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو، حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پاکنده تر ہے۔“

«وَالَّذِيْرَ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۝ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝» (۷/ الاعراف: ۱۶۹)

”اور آختر کا گھر پر ہیز گاروں کے لیے بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں۔“
اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آختر کی سزا میں بڑھ کر ہیں:

﴿فَإِذَا قَهُمُ اللَّهُ الْجُنُوْنَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعْدَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ مَمَّا كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾

(٢٦/ الزمر: ٣٩)

”پھر ان کو اللہ نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا اور آختر کا عذاب تو بہت بڑا ہے
کاش یہ سمجھ رکھتے۔“

﴿وَلَعْدَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُ وَأَبْغَى﴾ (٢٠/ طہ: ١٢٧)

”اور آختر کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر ہے والا ہے۔“

اگر آختر کا خیال کیے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کر لے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا
گھر بھی بھر لے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت و حشمت بے سود ہے:
﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوقِيَ إِلَيْهِمَا أَعْمَالُهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُنْجِسُونَ أُولَئِكَ
الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا ثَارٌ وَحِيطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَلِطَّلَانٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

(١١/ هود: ١٥-١٦)

”جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں، ہم ان کے اعمال کا بدلہ
انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تملقی نہیں کی جاتی، یہ لوگ ہیں جن
کے لیے آختر میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں اور جو عمل انہوں نے دنیا میں کیے سب بر باد
اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ضائع۔“

دنیا کی ساری بادشاہی آختر کی نعمتوں کے مقابلہ میں پر کاہ سے بھی کتر ہے:

﴿فَهَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ﴾ (٩/ التوبۃ: ٣٨)

”دنیا کی زندگی کے فائدے تو آختر کے مقابلہ بہت ہی کم ہیں۔“

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ﴾ (١٣/ الرعد: ٢٦)

”اور دنیا کی زندگی آختر کے مقابلہ میں بہت تھوڑا افادہ ہے۔“

اگر دنیا کے ساتھ آختر کی دولت نہ ہو تو دنیا کی لذت فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں:

﴿وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعٌ غَرُورٌ﴾ (٣/ آل عمران: ١٨٥) (٥٧/ الحدید: ٢٠)

”اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔“

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لیے نہیں، بلکہ دنیا کو آختر کے لیے برتا چاہیے، جمع کے خطبوں میں یہ

اکثر دہر ایسا جاتا ہے:

إِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَإِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ بِالْآخِرَةِ.

”دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔“

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گودنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لیے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (۲۹/ البقرہ)

”وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جوز میں میں ہیں تمہارے لیے پیدا کیں۔“

پھر دوسری جگہ بتایا کہ خود انسان کس لیے بنتا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّةَ وَالْإِنْسَانَ إِلَّا لِيَعْدُونَ﴾ (۵۱/ الذاريات)

”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔“

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لیے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ بتایا جائے دنیا کے کاموں سے آخرت کی تعزیت ہاتھ آئیں، یہ دنیا کی دولت اسی لیے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے:

﴿وَابْتَغِ فِيمَا أَنْتَ أَلِهٌ إِلَّا إِذَا الْدَّارُ الْآخِرَةُ وَلَا تَنْسَ نَصِيبُكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾

(۷۷/ القصص)

”اور اللہ نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کو ڈھونڈ اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول۔“

انہی معنوں میں (الدُّنْيَا مَزَرَّعَةُ الْآخِرَةِ) (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا نظرہ زبان زد ہے۔ قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح دکارانی کی خوش خبری دی گئی ہے۔ ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں، فرمایا:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَغْفِفُوهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخَلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيَمْكِنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي أَرْتَضَى لَهُمْ وَلَيَسْتَدِلُّهُمْ مِنْ بَعْدِ حَوْفِهِمْ أَمَّا مَنْ يَعْدُ وَنَقِيًّا لَا يُشْرِكُنَّ بِنِهَا طَ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَسِقُونَ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَأَثُو الزَّكُوْةَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّمُمْ تُرَحَّمُونَ﴾

(۵۵-۵۶/ التوران)

”جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو

ملک کا حاکم بنادے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنا یا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے، مستحب و پانیدار کرے گا اور خوف کے بعد امن بخشنے گا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کوششیک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرتے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کے پیغمبر کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔“

اللہ نے ایمان اور عملی صالح والوں کو زمین کی سلطنت، تمکین اور امن عطا فرمائے جانے کی غرض بتائی ہے، تاکہ وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پرواہ کر میری اطاعت، عبادت اور میری احکام کی بجا آؤ اور یہ اور میرے قانون کے اجراء میں لگے رہیں اور اگر اس امن وطمینان اور مانع طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکامِ الہی سے کوئی سرتاہی کرے گا تو وہ نافرمان بھہرے گا، نماز کا قیام، زکوٰۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَاتَّوْا الزَّكُوٰةَ وَأَمْرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوُا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَلَيْهِ عِلْمُ الْأُمُورِ﴾ (۴۱: ۲۲ / الحج:)

”یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور یہی کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوقِ الہی کی بجا آؤ اور کا سرعنوان ہے، قائم کریں اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں اور دنیا میں امورِ خیر کی تعمیل اور امورِ شر کے انساد کا اہتمام کریں، اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا دھوکا اور نہ شان و شوکت کا تماشا ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آؤ اور اس کے لیے جدوجہد اور سُعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔

عہدِ نبوی ﷺ میں اقسام حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں، وہ تمام تر اہل عرب کی وحشت، بدواوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں، لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظام حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دری پا تھی، چنانچہ ۱۸ بھری میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشتی عربیوں نے اسلام کے سامنے اپنی گروہ میں جھکا دیں، لیکن وقت کے تمدن کا سر پر غرور اب تک بلند تھا، چنانچہ نامہ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوہ موجیہ وغیرہ واقعات جو ۲۹ ہی میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافتِ راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی و تمددا نتیجہ تھیں۔

اس اجہال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت ﷺ کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتوں مشرق و مغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیرِ سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسری اور مغرب کی قسطنطینیہ کے قیصر کر رہے تھے اور ان دونوں کے ذائقے عرب کے عراقی و شامی حدود پر آ کر ملتے تھے، عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تمدید و تمدن کا نام نہ تھا، وہ انہی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے، یعنی بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسطی عرب اور حدود شام رومیوں کے ماختیز یا زیر اثر تھے۔

چنانچہ بھی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماختی میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی، جس کے فرمازوں عمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت کرتا تھا، یعنی میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں، لیکن آخر زمانہ میں یعنی خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آ گیا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یعنی میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پران سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربیوں کے ذہن میں جب کسی نظام سلطنت یا نظامِ تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظام سلطنت اور نظامِ تمدن کا آتا تھا، ان سے الگ یا ان سے بالاتر کسی نظامِ زندگی کا تجھیں ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا، اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظام حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو منا کر اسلامی تمدید و تمدن کی راغبیتیں ڈالی جائے۔ بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط، سیاسی مروعیت اور ان کے اخلاقی و تمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربیوں کو بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانونِ الہی کی اطاعت و فرمانبرداری میں دے دیا جائے اور بتایا جائے کہ قانونِ الہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک

کا دوسرا راستہ ہے، لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض و اعمال میں ترتیب و تدریج ملحوظ رہی ہے، اس طرح اسلام کے نظام حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی، چنانچہ اگرچہ آپ ﷺ ساری دنیا کی اصلاح کے لیے آئے تھے، مگر آپ ﷺ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا، تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور ﷺ کے سامنے بھی اور آپ ﷺ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے، قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أَمَةً وَسَطَّأْتَ لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا﴾

(۲/ البقرۃ: ۱۴۳)

”اور اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے تم کو تجویز کی امت بنایا، تاکہ تم لوگوں کو بتانے والے بن اور رسول تھمارا بتانے والا ہے۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امت مسلمہ کے لیے اور یہ امت مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و راہنمائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بروئے کار لالی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہل عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی، چنانچہ سب سے پہلے آپ ﷺ نے عرب کے اندر ورنی حصے یعنی تہامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور آپ ﷺ کی زندگی کے تقریباً سولہ سال انہی قبل کی اصلاح و ہدایت کے نذر ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخستان کی طرح اگرچہ بھروسہ یہ مامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لیے آمادہ تھے اور قبل میں کے ایک بڑے رکیس طفیل دوسری نے آپ ﷺ کو قبیلہ دوسری کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا، لیکن آپ ﷺ نے ان متعدد مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگاراخ زمین کو دارال歇ۃ بنایا، وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پر خطر تھا اور ابتداء میں مہاجرین بھی تھے کہ اس کی آب و ہوا بھی سازگار نہ تھی، تاہم آپ ﷺ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی، لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظامِ اسلام قائم ہو گیا اور صلح حدیثیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آگیا۔ اس بنابر اسلام کے دائرہ عمل کو وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندر ورنی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رو سائے قوم اور سردار ان قبل کے ذریعہ سے ہوئی تھی، آنحضرت ﷺ نے ان حصوں میں بھی یہی طریقہ دعوت اختیار فرمایا، چنانچہ سب سے پہلے قرب و جوار کے سلاطین و رؤساؤں کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبول اسلام پر آمادہ کر دینا تھا، چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامہ مبارک

آپ ﷺ نے لکھا تھا، اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدم قبول اسلام کا گناہ بھی تھا اسی گروہ پر ہوگا، اس سے اگرچہ خود قیصر کا دل نور اسلام سے منور ہو چکا تھا، لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تابع مرصح اور تخت زریں کی چک میں یہ روشنی ماند پر گئی، نجاشی بادشاہ جہش نے آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا، لیکن کے تمام رؤسائے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا، عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی، آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلعہ قع نہ ہوا کہا ہم غزوہ تبوک نے آپ ﷺ کے جانشیوں کے لیے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظام حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا، اب آنحضرت ﷺ کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا، چنانچہ جنت الوداع میں آپ ﷺ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

((إِنَّ الْرَّءَمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهْيَنِيَهُ يَوْمَ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ))

”زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آ گیا جس پر وہ اس دن تھا جس دن اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔“

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خود ساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعاں اور مظلوم سے لبریز شاہراہ نظامہ مہاۓ سلطنت کو بخوبی نیاد سے اکھاڑ دیا، اس انقلاب نے نہ صرف قصر کسری و قیصر کی شخصیتوں کا خاتمه کر دیا، بلکہ خود کسریت اور قیصریت کو صفائحہستی سے فاکر دیا، یہی پیشین گولی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی:

((إِذَا هَلَكَ كِسْرَى فَلَا كِسْرَى بَعْدُهُ وَإِذَا هَلَكَ قِيْصَرٌ فَلَا قِيْصَرٌ بَعْدُهُ))

”جب کسری ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی کسری نہیں اور جب قیصر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔“

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد اٹالی گئی، جس کا قانون اللہ کا قانون، جس کی حکومت اللہ کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا حکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک اللہ کی تھی، لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا کیساں حق تھا یا اس کو یوں کہیے کہ نظام اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی رعایا کا نگران حاکم ہے، شوہر اپنے اہل و عیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقات کا مول کا اور آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد مبارک کا کہ ((كُلُّكُمْ رَّاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْنُوُّلٌ عَنْ رِعْيَتِهِ)) یعنی ”تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیر گرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا۔“ یہی مطلب ہے۔ اس سے اسلام کے اصولی سلطنت کا ایک اساسی نقطہ نظر سامنے آ جاتا ہے۔

ابوداؤد، کتاب المنساک، باب الاشہر الحرم: ۱۹۴۷۔ ② صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبیة: ۳۶۱۹، ۳۶۱۸۔ ③ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القری والمدن: ۸۹۳۔

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں، ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اختاہ ہے اور لاکھوں کو تباخ کر کے اپنی طاقت و قوت سے سارے جھتوں کو توڑ کر ہزاروں گھروں کو دیران کر کے سب کو زیر کر کے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور ان تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے، مگر اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظام حکومت کی جدوجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مظہر نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ ﷺ کی شخصی سرداری، نہ خاندان قریش کی بادشاہی نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص و ہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا، صرف ایک شہنشاہ ارض و سما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمانِ الہی کے آگے سارے بندگانِ الہی کی سر افگندگی۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیامِ سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا، وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظامہ مہاۓ سلطنت کو مٹا کر جن میں اللہ کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھپرا دیا گیا تھا، اس کی وجہ اللہ کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں اللہ کے سوانہ کسی دوسری ارضی و سماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرمائزو افراد کی شخصیت، قویت، زبان، نسل، طبع اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون، طرزِ سلطنت، طریقِ حکومت اور عدل و انصاف اور احکام کے حق و باطل سے نہ ہو۔

اس مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب، ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب سے ہوا، ظاہری تو اس لیے کہ وہ ایاں اور روم کے درمیان واقع تھے، جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے ایسی ہی درمیانی ہے سایہ قوم کی ضرورت تھی اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظام سلطنت کو مٹانے کے لیے کام میں لائے، کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد اذل ہی سے ان میں دو یعنی رکھی گئی تھی، عرب کی فطری شجاعت، کوہ شکن عزم و استقلال، زرلہ انگریز قوت ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ اخلاقی عناصر حکومت اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں اور ان اوصاف کی جلا اخلاص، للہیت، صبر و توکل و اعتدال علی اللہ وغیرہ اخلاقی روحانی ہی سے ممکن تھی، اس لیے اولاد ان کو اس طرزِ حکومت سے پاک رکھا گیا، جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی و خاندانی اور قومی جاہ و جلال، رعب و اقتدار اور شہانہ ہبہت کو قائم رکھنے کے لیے اختیار کر رکھا تھا، مذکورہ بالا اخلاقی محاسن کے وجود بقا بلکہ ان کی ترقی و نشوونما کی ایک ہی صورت تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ، مامورِ کن اللہ، ایک پاکباز رہنما، ایک مقدس امیر، ایک معصوم امام کے پرتو صحبت اور تعلیم و تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشِ ضمیر، ایک ایسا نور ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبرا کراہ کے ہر فرد کو

احکام الہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کر دے۔ اس اصول پر جو نظام سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لیے دو شرطیں لازمی ہیں:

① یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔

② یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں، بلکہ اس کا اساس اولین محض اخلاص قلب اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظام سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا اور خلافتے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا اس نظام سلطنت کا بروائیتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کی رو سے چھوٹے بڑے، اونچے بیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایران نژاد، بندوق جاڑ کے عرب، جوش کے جوشی، سب ایک ہی سطح پر آ کھڑے ہو گئے اور بادشاہی و شہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق و مغرب میں بچھے تھے، الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہلکار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کر دیے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی، وہ عرب کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ اہل عرب فطرہ خود دار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب اسی پردازی تھی، مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، عجمی، جمیری، عسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں، جمیری دنیا میں دوسری شاہزادہ حکومتیں تھیں، یمن میں سبا اور حمیری سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں، اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیر اثر قائم ہوئی تھی، وہ بھی اسی نقشہ پر تھی، قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذلتی کردار مثلاً: شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کیے جاتے تھے، لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے متاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا تھا، اس میں سردار ان قبائل کے لیے خاص حقوق مقرر تھے، جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق ہیں جن کو صفتیہ، مریاع، نظیطہ اور نقول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو منا کر خس قائم کیا ہے، عام مجلس میں لوگوں کو سردار ان قبائل کے سامنے آزاداً گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو نہ ہبنا یہودی تھا، کہتا ہے:

وننکران شتنا على الناس قولهم ولا ينكرون القول حين نقول

”اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کر سکتے۔“

سردار ان قبائل اپنے لیے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حرب بوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے: ((لا حرمی الا حرمی اللہ و رسولہ)) ॥ ”اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔“ اس کا مقصد اسی رسم کا مانا تھا۔

صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب اهل الدار بیتوں ۳۰۱۲۔

سلطین شاہانہ شان و تخل سے اوپنے اوپنے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر و جواہر کے زیوروں سے آراستہ ہو کر اوپنے اوپنے بھیش بھائتوں پر جلوں کرتے تھے، ان کے امرا علی قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کر سیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے یک قسم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، نشست کے لیے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس و فرش حرام کیے گئے، سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لیے حرام شہرے، امام وقت اور اس کے حکام کے لیے مسجد اور اس کا سکھن ایوان تھا، حاجب و دربان کے پہرے اٹھ گئے، چاؤش و نقیب رخصت کر دیے گئے، طلاقی و نفرتی وزمر دیں خخت اٹھوادیے گئے، امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے پسندی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی، چنانچہ وضع لباس کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم میں کسی قسم کا فرق مراتب موجود نہ تھا، ایک مرتبہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ ایک شاہی عبا لے کر آئے، چونکہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفادار حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفادار آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ ﷺ اس کو زیب تن فرمائیں یا جمع کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربار عام کا دن ہے، آپ اس کو پسندیں، اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر اسلام کے لیے اس ظاہری جاہ و جلال اور تزک و احتشام پر گئی، جس کے شاہان وقت عادی تھے، لیکن حضور ﷺ نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوای شاہانہ جاہ و جلال کے انہمار کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”جو شخص اس کو پہنتا ہے آختر میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔“ *

اسی طرح نشست میں بھی آپ ﷺ نے تفویق و برتری کے امتیاز کو اس قدر منیا کہ مجلس کے اندر آپ ﷺ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آئے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمد ﷺ کون ہیں؟ لوگ اشارہ سے بتاتے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے، جس پر آپ جلوہ افروز ہوں، مگر اس کو بھی آپ نے پسند نہیں فرمایا۔ * ۲ اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنی تھے، مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانونِ الہی کی قیمت کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیت رسول تھے اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو، تو ان کے لیے دو ہری سزا ہے، ایک بار ایک محرومی خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت ﷺ نے اس کا ہاتھ کامیٹے کا حکم دیا، چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں، صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ گران گزرا اور انہوں نے آپ کی خدمت میں

* بخاری، کتاب الجناد، باب التجمل لل渥د: ۴۰۵۔ ۲ ابو داود، کتاب السنۃ، باب القدر: ۴۶۹۸۔
(صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے لیے ایک چھوٹا سا چبوترہ بنادیا)۔

حضرت اسامہ بن زیدؑ کے ذریعہ سفارش کرنی چاہی آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم سے پہلے کی قویں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دے دی جاتی تھی، مگر جب وہی جرم بڑے رتبے کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے، پھر فرمایا کہ اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کا قتا۔“ *

ایک بار آپ ﷺ صاحبہ کو مال تقسیم فرمائے تھے، ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آنحضرت ﷺ کے اوپر ٹوٹ پڑا، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی، آپ نے اس سے کوئی خدا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آ گیا، آپ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ ”آؤ اور مجھ سے قصاص لو“، لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ امیں نے معاف کر دیا۔ *

ایک بار آنحضرت ﷺ کے پاس بہت سی لوگیاں آئیں، حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کے ہاتھوں میں چکی پیتے پیتے چھالے پڑ گئے تھے، انہوں نے آنحضرت ﷺ کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کا ج کے لیے ان میں سے ایک لوگی عنايت فرمائیے، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”بدر کے نیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔“ * ابطال سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا، جاہلیت کے انتقام کے مثابے کا جب قانون عام نافذ ہوا تو سب سے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرا نبیلہ پر باتی چلا آتا تھا، معاف فرمایا۔ * اسلامی حاصل رکوڈ و صدقات و عشر و غیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائیگی میں خاندان نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی بنی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں، مخالف اس کے حضور ﷺ نے اپنے یہ جو خاص خطاب اللہ سے پایا، وہ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، عبدیت کاملہ ہی آپ کا کمال تھا، اعزاز کے وہ وہی طریقے جن کا سلطانی نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپ ﷺ نے ان سب کو منادیا، فرمایا: ”اللہ کے نزدیک سب سے برآنام یہ ہے کہ کوئی اپنے کوشش شاہان کہے۔“ * ایک دفعہ آپ ﷺ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا: ”یہ تو اللہ کے لیے ہے۔“ * آپ ﷺ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپ کو دوسرے انہیاں پر فضیلت دیں۔ *

ایک بار سورج میں گھن لگا، چونکہ اسی دن آپ ﷺ کے صاحزادہ ابراہیم (رضی اللہ عنہ) کا انتقال ہو چکا تھا

یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے شاگردیۃ الشفاعة فی الحدود اذار فرع الى السلطان: ۶۷۸۸۔

ابوداؤد، کتاب الديات، باب القود من الضربة وقص الأمير من نفسه: ۴۵۳۶۔

ابوداؤد، کتاب الخراج والamarah، باب فی بیان مواضع قسم الخمس: ۲۹۸۷۔

صحیح مسلم، کتاب الحجج، باب حجۃ النبی ﷺ: ۲۹۰۔ * صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب بعض الأسماء: ۶۲۔ * ابوداؤد، کتاب الادب، باب کرامۃ التمادح: ۴۸۰۶۔

صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبياء: ۳۴۱۶، ۳۴۱۲۔

اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گھن لگ جاتا ہے، اس لیے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیم ﷺ کی موت کی طرف منسوب کر دیا، لیکن جب آپ ﷺ صلواتہ کوفہ سے فائز ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ ”چاند اور سورج اللہ کی دونشانیاں ہیں، کسی کی موت و حیات سے گھن نہیں لگتا۔“ * ۱

ایک بار ایک شخص آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رعب نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ذر نہیں، میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔“ *

ایک بار آپ ﷺ کی خدمت میں ایک قیدی لا یا گیا، اس نے کہا کہ خدا یا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، محمد ﷺ کی طرف رجوع نہیں کرتا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کس کا تھا۔“ * ۲ حالانکہ یہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک دی جائی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔

ایک بار آپ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے، حالت نماز ہی میں ایک بدوانے کہا: اللہ! مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرم اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر۔ آپ ﷺ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدوانوں کا کہ ”تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمت الہی کو مدد کر دیا۔“ * ۳ حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ و فاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس فقرہ میں کیا تھا، جس پر سلاطین زمانہ اکرام و انعام کی بارش کرتے تھے۔ سلطنت کے مفتوح ہاتھ و محاصل کو دنیا کے باڈشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی و خاندانی عیش و آرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے، لیکن جو نظام سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لیے تھے، زکوٰۃ، صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بحیثیت امیر سلطنت سب کا سب آنحضرت ﷺ کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن آپ ﷺ نے اس کو اپنا نہیں، بلکہ باختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے، زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندان ہاشم پر حرام فرمادی اور اس کو حکم الہی عام غیر با اہل حاجت کا حق قرار دیا اور اس کو علما نے ظاہر فرمایا، ابو داؤد میں ہے:

*(قالَ مَا أُوتِيكُمْ مِّنْ شَيْءٍ وَمَا أَمْنَعُكُمْ إِنَّ إِلَاحَاظَنَ اضْعَعُ حِيثُ مَا مَأْمُرْتُ)
* ۱

* ۱ بخاری، کتاب الکسوف: ۱۰۴۱۔ * ۲ ابن ماجہ، ابواب الاطعمة، باب القدير: ۳۳۱۲۔

* ۳ مسند احمد، ج ۳، ص: ۴۳۵۔ * ۴ بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ۶۰۱۰۔

* ۵ ابو داود، کتاب الخراج والامارة، باب فيما يلزم الامام من أمر الرعية: ۲۹۴۹۔

”میں تم کو نہ کچھ دے سکتا ہوں نہ کچھ روک سکتا ہوں، میں صرف خزاں چیزیں ہوں، جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔“
دوسرا موقع پر فرمایا:

((انما انما قاسم و خازن والله يعطي)) *

”میں تو صرف بائیتے والا ہوں دینے والا تو اللہ ہے۔“

غیمت کام بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضور ﷺ کو صرف ایک خس یعنی پانچوں حصے پر تصرف کا اختیار ہوتا تھا، اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصے سے حضور ﷺ اپنے اہل بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے، جن کو جنگ کے قواعد کی رو سے مال غیمت سے کچھ بھی مل سکتا تھا، اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا، وہ حضور ﷺ کے تصرف میں گو براہ راست دے دیا جاتا تھا، لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضور ﷺ اس کی آمدی اپنے حواب بدید سے اپنے خالگی ضروریات میں صرف فرمائے کے بعد اسلام کی ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرمادیا تھا کہ یہ مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دک دیکھے چکے تھے، ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رب و تواریکے لیے ظاہری شاہانہ ترک و اقشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے، چنانچہ انہیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرت ﷺ سادگی و تواضع اور زہد و تقاضت کے بجائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی پر فرماتے، جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ پر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر بن الخطاب ﷺ کے اس مجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں، دیکھا تو آپ ایک چڑے کے تنکی سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھیں، یہی لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیئے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، مجرہ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سو کھل چڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البتہ نظر نہ آیا، ایک طرف مٹھی بھر جوڑ کئے تھے، اس منظر سے حضرت عمر بن الخطاب سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ حضور ﷺ نے رونے کا سبب پوچھا، عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں، جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ کا سارا اثاث البتہ میرے سامنے ہے ادھر قیصر و کسری ہیں جو باعث وہ بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں اور حضور ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں، ارشاد ہوا کہ ”اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخوند لیں اور وہ دنیا؟“ حضرت عمر بن الخطاب نے عرض کی کہ ہاں ابے ٹنگ یا رسول اللہ ﷺ نے عرض کی: * دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے عرض کی:

* بخاری، کتاب الجهاد، باب قول اللہ تعالیٰ: (فَانَّ اللَّهَ حُمْسَهِ)؛ ۳۱۱۷۔ الفاظ قدرے مختلف ہیں۔

* بخاری، کتاب النکاح: ۵۱۹۱ و مسلم، کتاب النکاح، باب الایلام: ۳۶۹۲، ۳۶۹۱۔

یا رسول اللہ ﷺ! دعا فرمایے کہ اللہ آپ ﷺ کی امت کو فارغ الالٰل کرے، کیونکہ روی اور ایرانی باوجود یہ کہ اللہ کی پرستش نہیں کرتے لیکن اللہ نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دیے ہیں، آپ ﷺ فھٹا اٹھ بیٹھے اور فرمایا: ”کیوں ابن خطاب! تم اس خیال میں ہو کر روی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دیے گے ہیں۔“ ۴۹۱ صَرِيرَ دَلْدَرِيَّ کَتَ شَيْرَدَ يَكْهَنَےَ كَوْهِ حَضْرَتُ عَمْرُ عَلِيِّ عَزَّ جَهَنَّمَ حَضُورُ انور ﷺ کے لیے تزک و اختشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرز و ظاہر کر رہے تھے، جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع ۴۹۲ ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زرد جواہروالے روم کے قیصر اور ایران کے کسری پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہرمیدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیس ﷺ بن سعد ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کر لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت ﷺ سجدہ کے سب سے زیادہ سخت ہیں، چنانچہ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ”ایسا ہر گز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو یو یوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔“ اسی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ ”کیا اگر تم میری قبر پر گزر دے گے تو سجدہ کرو گے؟“ عرض کی نہیں، تو فرمایا کہ ”تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہیے۔“ ۴۹۳

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذ ﷺ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضور ﷺ کو سجدہ کیا۔ آپ ﷺ نے حیرت سے فرمایا: ”معاذ یہ کیا؟“ ”عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو دل چاہا کہ میں بھی حضور ﷺ کو سجدہ کروں، ارشاد ہوا کہ ”اللہ کے سو اکی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو یو یوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔“ ۴۹۴

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہل عرب خود اس کے خونگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب و جوار کے سلاطین کی طرح عیش و آرام اور ترک و اختشام کے ساتھ دیکھیں، مگر آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھادیا کہ یہ اشکار و ترفع اور اسراف و تبذیر کی زندگی اللہ کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی یہ زینت و رونق سراب کی نمائش اور حباب کی سر بلندی سے زائد نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس کا کامل مجموعہ بن کر دکھادیا اور آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء

۴۹۱ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ التحریم: ۴۹۱؛ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب الایلاء: ۴۹۲۔ یعنی یوندار پر (محارف جلد ۲۲، عدد ۳، ص: ۱۸۱)۔

۴۹۳ ابو داود، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة: ۲۱۴۰۔

۴۹۴ ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأة: ۱۸۵۳۔

راشد دین اور صحابہؓ نے بھی اس کی بیروی کی اور یہی سادگی و تواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔ عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا و بخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امر اکے موروثی اتحاقاً اور سعی و سفارش کی بنابر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولت مندوں کی دولت مندی اور فقر اکی مبتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے احکام الٰہی کے تحت جو اسلامی نظام فرمایا اس میں دولت مندی اور تقرب نہیں، بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفا کا حق تو یا کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا، عرب میں لوئڈ یوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابو داؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس ایک تھیلی لاپی گئی جس میں کچھ یعنی مہرے تھے، آپ نے ان کو لوئڈ یوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا۔

سلطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات و تصعیات اور غلامی و عبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرف مدعا زبان پر آتا تھا۔ اسلام کے نظام حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور اور ﷺ کی عظمت و جلالت اگرچہ صحابہؓ نے حضور ﷺ کو بارگاہ نبوت میں ایک طاہر بے جان بنا دیتی تھی، تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے، ناٹشاندہ و آتا تو یا محمد ﷺ کہہ کر خطاب کرتا اور حضور ﷺ خود میں کے ساتھ جواب دیتے اور مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا تھا، آپ ﷺ کے احکام کی تکمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا، مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضور ﷺ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا اور حضور ﷺ اس کو شفقت سے سنتے تھے اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے۔

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لوئڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قائم رکھے یا تو زدے، حضرت بریرہؓ نے حضرت عائشہؓ کی ایک لوئڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انہوں نے اپنے شہر سے علیحدگی اختیار کر لی، ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے، آخر آنحضرت ﷺ نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ ”تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا۔“ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! یا آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ ”نہیں! سفارش ہے۔“ عرض کی: تو قبول سے معدود ہوں، آنحضرت ﷺ نے اس پر ان سے کوئی موافذہ نہیں فرمایا۔

غزوہ بدرا میں آنحضرت ﷺ نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فن جنگ کے بعض ماہر صحابہؓ نے عرض کی:

۱۔ یہ لوٹ واقعے ابو داؤد، کتاب الخراج، باب فی قسم النبی، ۲۹۵۱، ۲۹۵۲ میں ہیں۔

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، و باب شفاعة النبی ﷺ فی زوج بریرہ: ۵۲۸۳ اگر اس لوئڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے، اگر آزاد ہو تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔

یا رسول اللہ! آپ ﷺ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے، یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: ”رائے سے۔“ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! جگلی نقطہ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے، بلکہ ہم کو بدر کے کوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہیے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بے تال ان کی رائے پر عمل فرمایا، * اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ

((انتم اعلم بامر دنیا کم)) *

”تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو، تم زیادہ واقف ہو۔“

آنحضرت ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ زر و مادہ بکھور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لیے کرتے ہوں گے، اس لیے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا، چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا، تیجہ یہ ہوا کہ بکھوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں، آنحضرت ﷺ کا اوہ رگرہ تو دریافت فرمایا، انہوں نے صورت حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ ”میں نے اپنے گمان سے یہ بات کی تھی، تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو، ان تمام امور میں جن کا تعلق وحی سے ہے، میری اتباع ضروری ہے، لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشرطی ہوں تم آزاد ہو۔“ *

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربوں سے ہے، یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے، لیکن جن امور میں آنحضرت ﷺ کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحتِ الہی پر بنی ہوتا، جس کی اطلاع حضور ﷺ کو بذریعہ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان کا فتحا حکمِ الہی ہوتا تھا، جس کا ماننا ہی ضروری ہے، اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوہ حدیبیہ میں جب آنحضرت ﷺ نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے، اس لیے وہ جوش اسلام سے بے تاب ہو گئے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کیا چیز برحق نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بے شبه ہوں۔“ انہوں نے کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ ”بے شبه ہیں۔“ انہوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”میں اللہ کا چیخنگیر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مددگارے گا۔“ انہوں نے کہا کہ کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال

* سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۳۷۸۔

* صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امثال ما قاله شرعا: ۶۱۲۸۔

* صحیح مسلم، باب الفضائل، باب وجوب امثال ما قاله شرعا: ۶۱۲۷۔

کریں گے؟“ انہوں نے کہا: نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ‘س تو پھر آؤ گے اور طوف کرو گے،’ لیکن حضرت عمر بن الخطابؓ کو اس سوال و جواب سے بھی تسلیم نہیں ہوئی، تو حضرت ابو بکر بن الخطابؓ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی، انہوں نے بھی وہی جواب دیے جو رسول اللہ ﷺ نے دیے تھے، آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آگئی تو انہوں نے خود اپنی اس عرض و معرض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا، روزے رکھے اور غلام آزاد کیا۔ ۲۱۳ اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے گوہت کچھ عرض و معرض کی، مگر حضور ﷺ نے اپنے فیصلہ نہیں بدلا، کیونکہ یہ فیصلہ اراءتِ ربانی سے کیا گیا تھا۔

اس طرح اسی واقعہ حدیبیہ میں جب شرائطِ صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا، تو چونکہ ان کے شدتِ شوق زیارتِ کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی، اس لیے ان کو حزن و ملال ہوا اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیل ارشاد میں تساہل بردا، جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضور ﷺ یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرارِ مصلحتِ ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت ﷺ پر شاق گز را اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہ بن عثمان کے پاس تشریف لے گئے، ام المومنین نے چہرہ مبارک پر آزر دگی کا اثر پا کر سبب دریافت کیا، آپ ﷺ نے واقعہ بیان فرمایا، حضرت ام سلمہ بن عثمان نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، آپ خود اپنا احرام کھول دیں، چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا، شمعِ نبوت کے پروانوں (صحابہؓ) نے یہ دیکھ کر مجھہ لیا کہ اب حضور ﷺ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے، پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر نوٹے پڑتے تھے۔ ۲۱۴ اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں، حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امرِ الٰہی سے تھا، اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پرواہی نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہ بن عثمان نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی، جس کا تعلق علمِ انسن اور امور تجربیہ سے تھا، اس لیے اس پر بلا تامل عمل فرمایا۔ ۲۱۵

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں لوگ اپنی کم فہمی، ناقابت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضور ﷺ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضور ﷺ نے اس پر چل فرمایا اور معرض کو اس کی گستاخی

۱ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲۔ نیز دیکھیں فی الباری شرح حدیث مذکور۔

۲ صحیح بخاری، ایضاً۔ ۳ اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہ کرے کہ خدا خواستہ علم انسن کا یہ نقطہ آنحضرت ﷺ پر سے بڑھ کر حضرت ام سلمہ بن عثمان کو معلوم تھا ہاتھ یہ ہے کہ شاگردوں کے علم و حقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں، جن سے کبھی ان استادوں کو اس لیے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے ادھران کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کو خود اسی استاد کے فیض ہی سے حاصل ہوئی تھی۔

کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زیر اللہ عزیز اور ایک انصاری صحابی میں آپا شی کے متعلق نزاع ہوئی، صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زیر اللہ عزیز کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا، انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں حضرت زیر اللہ عزیز چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں، آخر معاملہ آنحضرت علیہ السلام تک پہنچا، قانون اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جوز میں کنوئیں سے قریب تر ہوا سی کو پانی لینے کا حق ہے، دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لے جائے، لیکن آپ علیہ السلام نے حضرت زیر اللہ عزیز سے فرمایا کہ تم پہلے آپا شی کرو، پھر پانی کو اپنے پڑوئی کے کھیت میں جانے دو، یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا۔ لیکن اس فیصلہ پر تقاضا کے بھرپور سے وہ انصاری سخت برہم ہو گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! آپ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زیر اللہ عزیز آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، یہ سن کر آپ علیہ السلام کے چہرے کا رنگ بدل گیا، تب آپ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا حضرت زیر اللہ عزیز سے فرمایا کہ ”زیر! آب پاشی کر کے پانی روک لیں، یہاں تک کہ کھیت کی میدان تک پہنچ جائے۔“ ۱ یعنی پانی بہہ کر میدان کے اوپر سے دوسرے کے کھیتوں میں از خود چلا جائے، یوں نہ جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت علیہ السلام مال غیرمت کی تقسیم فرمائے تھے، قبیلہ بنوتیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخوبیصرہ تھا، آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! انصاف فرمائے! آپ علیہ السلام نے فرمایا: ”اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟“ ذوالخوبیصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر بن الخطاب کو غصہ آگیا اور آنحضرت علیہ السلام سے کہا: اگر آپ اجازت دیجی تو اس کی گردون اڑا دوں، لیکن آپ علیہ السلام نے ان کو روک دیا ۲ اور فرمایا کہ ”اس کے کچھ ہماری ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی، یہ قرآن پڑھیں گے، لیکن وہاں کے گلے کے یقینیں اترے گا، یہ مسلمانوں کے تفریق کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے۔“ (یہ پیشین گوئی امیر المؤمنین حضرت علیہ السلام کے زمانہ میں خارج کے ظہور سے پوری ہوئی) یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرض واجب کی حد سے گزر کر گستاخی کی حد تک بہنچ گئے تھے اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چیزیں منافق ہوں، تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جمالت اور غلط فہمی سے برے اسلوب سے بھی آپ علیہ السلام پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت علیہ السلام اپنے کرم و شفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے، آنحضرت علیہ السلام کے اس طرز عمل میں آپ کے بعد آنے والے خلفاء اور امراء اسلام کے لیے حق شناسی، حق کوشی، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ و اعزاز اور خیر و غرور کو دل نہ دینے کی لکھتی بڑی تعلیم تھی۔

عمال و حکام و رحیقیت خلیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں اس لیے ان پر لکھتے چینی کرنا گویا خود خلیفہ

۱ ابو داود، کتاب القضاۓ، باب فی القضاۓ: ۳۶۳۷۔

۲ بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام: ۳۶۱۰۔

پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے، عہد نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمال بنوی کی شکایت کی اور آنحضرت ﷺ نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو، یا حکام کی حمایت میں معتبر ضیں پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور پر سے دونوں کو سمجھا دیا، حکام و عمال سے فرمایا: "ہاں! مظلوم کی بدعا سے بچتے رہنا کہ ان کی دعا اور قبول میں کوئی چیز خارج نہیں ہوتی۔" * اور معتبر ضیں سے فرمایا کہ "تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو۔" ** لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ موقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضور انور ﷺ سے درشتی اور حکم کے ساتھ مطالبہ کیا اور آنحضرت ﷺ نے ایسے معتبر ضیں کے ساتھ بھی لطف و کرم فرمایا اور عدل و انصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک ہمارا ایک اعرابی نے آ کر آپ ﷺ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے تھنچی کہ آپ کی گردان سرخ ہو گئی، آپ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا: میرے ان دونوں اونٹوں کو لا دو، کیونکہ جو لا دو گے وہ نہ تمہارا مال ہو گا اور نہ تمہارے باپ کا، حضور ﷺ نے تین بار فرمایا: "نہیں، استغفار اللہ، نہیں استغفار اللہ، نہیں استغفار اللہ۔" اس کے بعد فرمایا: "میں اس وقت تک نہیں لا دوں گا، جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے، اس کا بدلہ نہ دو۔" مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا، پھر آپ ﷺ نے معاف فرمایا کہ حکم دیا کہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرا پر کھجوریں لا دو دی جائیں۔ *

ایک دن ایک بدوا آیا، جس کا کچھ قرض آنحضرت ﷺ کو رکھا، بد و عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہؓ نے اس گستاخی پر اس کو ڈالنا اور کہا: تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہمکام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ "تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس کا حق ہے۔" اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا اور اس کے حق سے زیادہ دلوادیا۔ *

ایک دفعہ ایک بدوا اونٹ کا گوشت بیج رہا تھا، آنحضرت ﷺ کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہا رے موجود ہیں، آپ ﷺ نے ایک وحق چھوہا روں پر گوشت چکالیا، گھر میں آ کر دیکھا تو چھوہا رے نہ تھے، باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہا روں پر گوشت چکایا تھا، لیکن چھوہا رے میرے پاس نہیں ہیں، اس نے واپس مچایا کہ ہائے بد معاملگی، لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ ﷺ بد معاملگی کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں، اس کو چھوڑ دواں کو کہنے کا حق ہے۔" پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپ ﷺ نے پھر فرمایا: "اس کو کہنے دو، اس کو کہنے

* بخاری، کتاب الزکاة: ۱۴۹۶۔ ** صحیح مسلم، کتاب الزکوة، باب ارضاء السعاء: ۲۲۹۸۔

* سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی الحلم و اخلاق النبی ﷺ: ۴۷۷۵۔

* ابن ماجہ لصاحب الحق سلطان: ۲۴۲۶، ۲۴۲۵۔

کا حق ہے۔“ اور اس جملہ کوئی بارہ رہاتے رہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجو دیا کہ اپنے دام کے چھوپاڑے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوپاڑے لے کر پلنا تو آپ ﷺ صاحبہ بنی اسرائیل کے ساتھ تشریف فرماتھے، اس کا دل آپ کے حلم و غفو اور حسن معاملہ سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا: ”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! تم کو اللہ جزاۓ خیر دے، تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی۔“ *

بہر حال یہ مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے، ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جادو ناروا بے ہو گیوں کے مقابلہ میں پیش آئے، جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعدہ جس زمانہ میں یہودی تھے، میں دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے کچھ قرض لیا، میعاد ادا کی میں بھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے اور آنحضرت ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت دست کہہ کر کہا کہ ”اے عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حلیے حوالے کیا کرتے ہو۔“ حضرت عمر بن الخطابؓ سے بے تاب ہو گئے، اس کی طرف منہ کر کے کہا: اول اللہ کے دشمن! رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے مسکرا کر کہا: ”عمر! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ وہ نبی سے تقاضا کرے اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں۔“ یہ فرمایا حضرت عمر بن الخطابؓ کو ارشاد ہوا کہ جاؤ اس کا قرضہ ادا کر کے اس کو میں صاعِ کھجور کے اور زیادہ دے دو، یہودی حلم و غفو کے اس پڑا شر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ *

ایک دفعہ آپ ﷺ کے پاس صرف ایک جوز اکٹھا رہ گیا اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینے آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوز اس سے قرض منگوا لیجئے، آنحضرت ﷺ نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا: میں سمجھا مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑالیں اور دام نہ دیں، آنحضرت ﷺ نے یہاں گوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ ”وَخُوبٌ جَانِتَاهُ كَمْ مِنْ سَبْ سَيِّدَ زِيَادَهُ اَمَانَتَ كَادَ اَكْرَنَ وَالاَهُوْنَ۔“ *

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور ﷺ، جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے، لوگوں نے اس حیثیت سے آپ ﷺ پر جو ختنت سے سخت اعتراض کیا، آپ ﷺ نے اس کو کس حلم اور غفو سے سنا اور معاملہ کا فیصلہ کیا یا واقعہ کی تفصیل فرمائے کوئی لوگوں کی تسلی کر دی۔ ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلطین اور امراء کے غور و تختیر سے ملائیے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو ختنت سے سخت عبرت ناک سزا میں دیتے ہیں اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان

* مسند احمد بن حنبل، ج ۶، ص: ۲۶۸۔ ** یہ روایت دلائل النبوة بیہقی، جماعت ابواب استلة اليهود، ۷، ص: ۳۰۱؛ بن حبان: ۲۸۸؛ طبرانی فی الکبیر، ج ۵، ص: ۱۶۵ اور ابویعین نے روایت کی ہے اور یہوی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (شرح خفایاء زہبہ غفاری)، ج ۲، ص: ۱۳۴ (فصل حلم)۔

*** جامع ترمذی، کتاب البيوع، باب ماجاء فی الرخصة فی الشراء الی اجل: ۱۲۱۳۔

کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ بھی ہے کہ ذات شاہانہ ہر مواد میں سے بری اور ہر دارو گیر سے بر تر ہے، اس سے بھلا بر ا جو کچھ ہو، وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے، لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور، حاکم و حکوم اور رائی و رعیت قانون کی دارو گیر اور سزا اور مواد میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ مخصوص تھے، جن کا ہر قول فعل جائز حدود سے بھی باہر نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ تمام تر مستحبن ہی ہوتا تھا اور آپ کی خدمت اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصل جہنم کر سکتی تھی، با ایں ہمہ آپ کے ذاتی کار و بار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال وجواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا صرف اس لیے تھا کہ آپ ﷺ کا یہ سوہ آئندہ امر ائے اسلام کی تعلیم کے لیے عملی سبق ہوا اور اس کے لیے غایت شفقت سے خود رحمت برداشت فرماتے تھے، تاکہ آئندہ آنے والے امر اور حکام استفسار و اطمینان رائے کے دروازے کو امت پر بند نہ کریں۔

عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں، ان میں ایران نے بھی ذات شاہانہ پر اس رو در رو سوال و جواب استفسار اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا، یونان اور روم میں کسی زمانے میں سختے ہیں کہ جمہوری سلطنتیں قائم تھیں لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امرا کی تھیں، ان کا تعلق عوام سے نہ تھا اور ان کو امراء کے مقابلے میں یہ حق سوال و مواد میں حاصل تھا اور نہ ان کے امراء حکام میں اس تواضع، اس خاک ساری، اس عفو و حلم، اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا اور نہ آسکتا تھا، وہ اخلاص قلب و صداقت اور پاکیزگی اخلاق کے اس بلند نصب اعین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا اور وہ اس کے پیغمباری تھے اور وہ اس دیوتا کے لیے سب کچھ کر سکتے تھے اور ان کا وطن چہار دیواری میں محدود تھا، جس کے باہر گویا انسان نہیں بنتے تھے، اسلام پہلادنہ ہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز نا آشنا تھی، اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے کہ یہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے، بلکہ اس ذات اقدس ﷺ سے ہے، جس کی خاک عقیدت مسلمانوں کی پیش ادب کا سرمه تھی اور جس کی حیثیت مخفی ایک امیر اور حاکم کی تھی، بلکہ اس سے بدر جا بڑھ کر ایک مخصوص رسول اور ایک پاک نبی کی تھی، صلوات اللہ تعالیٰ علیہ۔ اس کے بعد سلطنت و امارت اور حکومت کے کار و بار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے، ظاہر ہے کہ حضور انور ﷺ کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ ﷺ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہواں کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی، لیکن آپ مشورہ کرتے تھے، ایک تو اس لیے کہ ان سے رائے لینے میں ان کا دل بڑھ اور دوسرے اس لیے کہ چونکہ آپ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا ہے، اس لیے آپ ﷺ کا یہ فعل

یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنے والے خلاف امر کے لیے مثال و نظر کا کام دے، آپ ﷺ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ **«وَشَارِهُمْ فِي الْأُمْرِ»** (آل عمران: ۱۵۹)

”اے رسول ﷺ! امور سلطنت و جنگ و صلح میں اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے۔“

چنانچہ حضور ﷺ نے اس پر بہ نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی، انہوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ

«وَأَمْرُهُمْ شُورٰى يَبْتَهِمْ» (الشوری: ۴۲)

”ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔“

اگرچہ عہد نبوت میں حکومت کے سارے اجزاء وجود پذیر نہیں ہوئے تھے اور نہ چند اس کی ضرورت تھی، تاہم احادیث کے تعمیق و استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حکومت سے متعلق، متعدد اہم امور کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا اور ان کی رایوں پر عمل کیا اور اس کا منتظر اصرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تاکہ مفید نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو، نہایت مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور ﷺ کو اس کی چند اس حاجت نہیں۔

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز بآجاعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیوں کر ایک مسجد میں جمع کیا جائے، اس کے متعلق ہنوز وہ بھی نہیں آئی تھی، اس لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا، یہود و نصاریٰ کے بیہاں ایسے موقع پر بوق و ناقوس بجا یا جاتا تھا بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا، *** بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی، لیکن آپ ﷺ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا، آخر میں حضرت عمر بن الخطاب نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے تو آپ ﷺ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلاal بن عطیہ کو حکم دیا، انہوں نے الصلوٰۃ جامعۃ کہہ کر پکارا، اس کے بعد ایک دن آنحضرت ﷺ کو حکم دیا میں اذ ان کی موجودہ صورت دکھائی گئی *** اور فیض تاثیر سے بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا اور آ کر آنحضرت ﷺ سے بیان کیا،****

چنانچہ آپ ﷺ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلاal بن عطیہ کو اذ ان دینے کا حکم دیا۔ *****

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یامیدان جنگ کے قریب پہنچ کر آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا

❶ بخاری، کتاب الادان، باب بدء الادان: ۶۰۴ نیز وہ بھیں مشکوٰہ، باب الادان۔

❷ مصنف عبدالرازاق وطبقات ابن سعد وكتاب المراسيل لابن داود وفتح الباري ابن حجر وروض الانف سهيلي وزرقاني على المواهب ونووى شرح مسلم باب بدء الادان۔ نووى میں ہے: فشرعه النبي ﷺ، بعد ذلك اما بوحى واما باجتها د ﷺ على مذهب الجمهور في جواز الاجتهد له ﷺ وليس هو عملاً بمجرد المتنام هذا مالا يشك فيه بلا خلاف۔ ***** ابو داود، کتاب الصلوٰۃ، باب كيف الادان: ۴۹۹ ترمذی باب بدء الادان: ۱۸۹۔

کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ باری باری سے ممتاز صحابہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اپنی رائے ظاہری کی، یہاں تک کہ ایک رئیس نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ! ہم بی اسرائیل کی طرح نہیں جو شفیعہ سے یہ کہہ دیں کہ تم اور تھہار ارب جا کر کمیدان جنگ میں دشمنوں سے لڑے ہم تو نہیں رہیں گے، اللہ کی قسم! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے۔ اس کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم میدان جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑا اؤڈالنا چاہا، ایک تجربہ کار صحابی نے آ کر عرض کی: یا رسول اللہ! آپ حسب فرمان الہی اس مقام پر لشکر کا پڑا اؤڈالنا چاہتے ہیں یا حضور کی یا اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ ”یہ میری رائے ہے۔“ اس پر انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑا اؤڈالنا چاہتے ہیں تاکہ پانی اپنے قبضہ میں رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا وہیں جا کر قیام فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کیے گئے تو آپ نے پھر تمام صحابہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون ساطر عمل اختیار کیا جائے، لوگوں نے مختلف رائیں دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا۔

احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں، اس پر عبد اللہ بن ابی بن سلوول منافق مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کو چوپ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، پھر پر جوش جاں خشار صحابہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عرض کرنا کہ حضور شہر سے باہر نکل کر ہم کو لڑانا چاہیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا امور حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوہ حنین میں جب قبلیہ ہوا زن کا وفادا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو مال غنیمت میں آپ کے پاس آیا ہے، واپس کر دیا جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے، ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہو گا۔“ ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا اور آپ نے ان کی درخواست قبول کر لی، اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کسی کو سرتائبی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی آپ نے تمام صحابہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ ”تمہارے یہ بھائی کفر سے تاب ہو کر آئے ہیں اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں، اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے، جس کو مجھ سے اتفاق ہو، وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو، وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں، جس وقت پہلا مال غنیمت آئے گا، ان کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا۔“ تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اٹھ کر یا رسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس عاجلانہ اظہار

* سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۷۵۔ * سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۷۸۔

* ترمذی، ابواب التفسیر باب ومن سورة الانفال: ۳۰۸۴۔

رائے کو کافی نہیں سمجھا، فرمایا کہ ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے کون راضی نہیں ہے؟ اس لیے ہر شخص کو اپنا ایک قائم مقام و عریف ہمارے پاس بھیجنा چاہیے، چنانچہ ان قائممقاموں نے تمام لوگوں سے نکلوکر کے آپ ﷺ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی۔

احادیث کی کتابوں کا استقصا کیا جائے تو اور یہی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے عہد مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیام سلطنت اور آئین سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذهب اور عبادات بنادیا، اس شعبہ حیات کو جس میں تمام ترقیدگی، بھیت، بکر فریب، غل و سازش، ظلم و تم اور جور و تعدی شامل تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے، اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک و بلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا، احادیث میں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ ((السلطان ظل اللہ فی الارض یاؤی الیه کل مظلوم من عباد اللہ)) ﷺ یعنی "صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ ہے، جس کے دامن میں بندگانِ اللہ میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے۔" حضرت ابو مکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ

السلطان العادل المتواضع ظل اللہ و رمحه فی الارض۔

"عادل اور متواضع حاکم زمین میں اللہ کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔ خود حضور ﷺ نے فرمایا:

"عادل امام کو قیامت کے دن اللہ کا سایہ تھیب ہوگا۔"

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں، ان کو اپنے اس حسن عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا، جس طرح دوسری عبادات کا، گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہو گئی اور ہر قسم کی بد دیانتی، خیانت، فریب، سازش،

1 ابو داود، کتاب الجناد باب فی فداء الاسیر بالمال: ۲۶۹۳ و صحیح بخاری، کتاب المغاری، ۴۳۱۸، ۴۳۱۹۔
2 یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ برایت ابو یحیہ رضی اللہ عنہ این نجاشی اور برایت ابن عمر رضی اللہ عنہ تکمیلی اور حاکم میں اور برایت ابو مکر صدیق رضی اللہ عنہ این ابی شبیہ میں ہے، یہ حضور ﷺ تک مرفع نہیں بظہر ان حضرات صحابہ کے اقوال میں تفصیل کے لیے دیکھیں مقاصد الحسنة خاکو اور کشف الخفاء و مزبل الانباس اسماعیل عجلونی، ج ۱، ص ۴۵۶: ۱۳۵۱ لظ سلطان۔ یہاں یہ بارکھنا چاہیے کہ قدیم عربی میں سلطان کے معنی بادشاہ کئیں، بلکہ طاقت قوت کے ہیں، جو انگریزی لظ پاور(Power) کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مترادف ہیں، اس لیے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ میں خدا کا سایہ ہے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ عادلانہ نظام حکومت کلائقاتِ اللہ کے آرام و آسائش کے لیے گویا میں میں رحمتِ اللہ کا سایہ ہے، ہاں یہ سمجھنے کے عکس حکومت پر بھی اس مناسبت کے کہ حکومت کے نمائندے ہیں سلطان کا اطلاق ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے ((اکسلطان ولیٰ قمِ نَلَوْلَیَّةَ)) یعنی "جس کا کوئی ولی سہواں کا ولی سلطان ہے۔" یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے، اس لیے اس کا بہرا جائز نمائندہ جیسے قاضی اور حاکم اور ولی سلطان کہلاتے ہیں اس کے معنی میں یہ لفظ غالب اپنی صدری میں سلطانِ محمود کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔

3 صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب فضل من ترك الفواحش: ۶۸۰۶۔

تعدی و ظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہو گیا، امیر معاویہ رض نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدت معینہ کے لیے صلح کر لی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لیے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں، ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ نے اس کو بعد عہدی قرار دیا ہے، جس سے مسلمانوں کو بازار ہننا چاہیے، یہ سن کر انہوں نے اپنی فوج ہٹالی۔

ہر سلطنت کو تیکس، ماں گزاری اور خراج کے وصول کرنے کے لیے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا تھا اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پرواٹی ظاہر ہو تو دفعیہ سلطنت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آ لو دنگا ہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے خدع و فریب، مکروہیں اور دروغ بیانی سے کام لینا پناہ سب سے بڑا فرض خیال کرے گا، اس میں شخصی و جمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ متارج کیساں طور پر ظاہر پذیر ہوں گے، یورپ آج ظاہری و نمائشی تمدن و تہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے۔ تمام ملک میں تعلیم عام ہو گئی ہے، ہر فرد موزیسیا سے واقف ہو گیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلم ہو گیا ہے، لیکن با ایں ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی حاصل سلطنت کو بخوبی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہو گا۔ مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپیش ہو جاتے ہیں، کبھی جرم کے پاداش سے نپتے کے لیے ہزاروں، لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں، باوجود یہ کہ یورپ میں بہت اور جگہوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے اور سزا محض اخلاقی اصلاح کے لیے دی جاتی ہے، لیکن با ایں ہمہ کوئی یورپیں اپنے جرام کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرأت و دلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے، لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہر فرد سلطنت کے تمام ادکام کو نہ ہی پابند یوں کی طرح موجب عذاب و ثواب سمجھتا ہے، اس لیے ان پر بلا جراوا کراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے، اسلام کا نظام سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا، صدقہ و زکوٰۃ عرب کے لیے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس و غربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لیے مشکل تھا، چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی، ان میں ایک صدقہ و زکوٰۃ کی گراں باری بھی تھی، صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے اگرچہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک ہی میں عمال

* سنن ابی داود، کتاب الجهاد، باب فی الامام يکون بینه وبين العدو عهد: ۲۷۵۹

مقرر کر دیے گئے تھے، تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر و سر برست اور نظام قائم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دینیوں سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں، لیکن یہ اسلام کے نظام سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لا کر پیش کرتا تھا اور اس کے صدر میں آنحضرت ﷺ کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا، صحیح بخاری میں عبداللہ بن ابی اوی سے روایت ہے:

کان رسول اللہ ﷺ اذا اتاه قوم بصدقهم قال: ((اللّهُم صلّ علی الْفَلَان)) فاتاہ ابی بصدقہ فقال: ((اللّهُم صلّ علی الْفَلَان ابی اوی)) *

آنحضرت ﷺ کی خدمت اندرس میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوتی تھی تو آپ ﷺ فرماتے تھے کہ خداوند افالاں کی آل پر رحمت نازل فرماء، چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لے کر آئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ خداوند ابا اوی کی آل پر رحمت بھیج۔

حضرت عذری بن حاتم ؓ قبیلہ ط کے سردار تھے اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مریاں یعنی چوہا حصہ ملتا تھا، جو عرب میں اسلام سے پہلے سردار ایں قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا، لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے انہی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اپنے قبیلے کا صدقہ پیش کیا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بارہ حضرت عمر ؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

ان اول صدقہ یتیضت وجه رسول اللہ ﷺ وجوہ اصحابہ صدقہ طی جئت بها الى رسول اللہ ﷺ .

”پہلا صدقہ جس کی صرفت سے آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ ؓ کا چہرہ چک اٹھا، قبیلہ ط کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر آئے تھے۔“

قبیلہ بن یتیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((صدقات قومنا)) *

”یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔“

اٹھا صاحب کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جا کر بوجہ ڈھونتے تھے اور اس سے جو

1 صحیح بخاری، کتاب الرکوٰۃ، باب صلوٰۃ الامام و دعاء، نصاٰحہ الصدقۃ: ۱۴۹۷۔

2 صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل غفار و اسلم: ۶۴۴۹۔

3 صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضائل غفار و اسلم: ۶۴۵۱۔

مزدوری ملیتی تھی اس کو لا کر صدقہ میں دیتے تھے۔ ❶

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گووہ مٹ تو نہیں گئے تھے، لیکن اس درجہ کم ہو گئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے مرتكب ہوتے تھے تو جرم کا نشوونے کے ساتھ ہی ان کے دل نو رایمان سے چمک اٹھتے تھے اور اس داغ کو دھونے کے لیے بیتاب ہو جاتے تھے، چنانچہ بعض صحابہ نبی ﷺ نے بارگاہ نبوت میں آ کر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے۔ اسلام میں جرائم کی سزا میں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں، مثلاً: چوری کے جرم میں باتحکم کائے جاتے ہیں، زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں یا سنگار کیا جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور یہی حکمت لوگوں میں اعتراف جرم کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور جرم خود حاضر ہوتے تھے اپنے جرموں کا از خود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ماعز بن مالک رض ایک صاحب تھے، انہوں نے ایک لوٹدی کے ساتھ زنا کیا، جب انہیں ہوش آیا تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر از خود اس جرم کا اظہار کیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجئے ❷ یا رسول اللہ! مجھ پر حد جاری فرمائی جائے، آپ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا، انہوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے مجھ پر حد جاری فرمائیے، اسی طرح وہ بار بار اعتراف جرم کرتے تھے اور آپ اعراض فرماتے رہے، چوتھی بار آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کیا تم اس کے ساتھ ہم بستر ہوئے؟“ انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”کیا تم نے اس کے ساتھ مہاشرت کی؟“ انہوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟“ انہوں نے کہا: ہاں۔ ان تمام مراتب کے بعد آپ نے ان کے سنگار کرنے کا حکم دیا، جب ان پر پتھر برنسے لگے تو انہوں نے بھاگنا شروع کیا۔ بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر ماری اور وہ دیں ٹھنڈے ہو گئے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا۔ شاید وہ توبہ کرتے اور اللہ ان کی توبہ کو قبول کر لیتا۔“ ❸

اس واقعہ سے قانونی سزا میں ایک غنی دفعہ کا اضافہ ہوا کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پاہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلتا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع کر جو کہ اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ اللہ کے پرداز ہو جائے گا۔

❶ صحيح بخاري، كتاب الزكوة، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة: ١٤١٦، ١٤١٥ وكتاب الاجارة، باب من

اجر نفسه: ٢٢٧٣۔ ❷ صحيح سلم، كتاب الحدود، باب من اعترف على نفسه بالزنى: ٤٤٣١۔

❸ ابو داود، كتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالک: ٤٤١٩ وصحيح بخاري، كتاب الحدود، باب الرجم بالصلب: ٦٨٢٠۔

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا، لیکن انہوں نے از خود اپنے تیارداروں سے اس کا اقرار کیا اور ان سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتویٰ پوچھو، چنانچہ حضور ﷺ سے عرض کیا گیا، حضور ﷺ نے ان کی شدت عالالت کے سبب سے ایک معمولی سزا تجویز کی۔ *

کعب بن عمر و ایک اور صاحب کا واقعہ ہے جنہوں نے آکر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے ایک بیگانے عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے، گوہم بستہ نہیں ہوا تو یہ گناہ گار موجود ہے، اس پر اللہ کا حکم جاری فرمائیے۔ ②

غزوہ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک جوشی نے جس کا نام محلم تھا، قبیلہ شیع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرف داریں خدمت القدس میں آئے اور فیصلہ چاہا، آنحضرت ﷺ نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دیا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں، ایک نے اللہ کر کہا یا رسول اللہ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے، ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے، لیکن حضور ﷺ نے دیت ہی پر زور دیا یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ابھی جھسے یہ گناہ ہوا ہے میری مغفرت کے لیے دعا فرمائیے۔ *

یہ واقعات ایک دنیوی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نہایاں حد فاصل قائم کر دیتے ہیں، دنیوی سلطنت میں مجرم اس لیے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی، لیکن ما عزیز ﷺ اور دوسرے صحابہ ﷺ نے اس بنا پر جرم کا اعتراف کیا کہ دنیاوی سزا کے اجراء وہ آخرت کے عذاب سے نج چائیں گے اور آنحضرت ﷺ کی دعا و استغفار سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے، دنیوی سلطنت میں جلا دا اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے، لیکن صحابہ ﷺ نے ما عز پر اس لیے پھر بر سائے کہ انہوں نے حکم الہی کی بے محابا تنفیذ کی تو مغلیق پائی، دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے، لیکن اسلام کے نظام سلطنت میں وہ تو بکاذر یعنی ہے۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرزِ عمل میں اس موقع پر نہایاں امتیاز قائم ہو جاتا ہے، جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہنچانے کے لیے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک رحم دل دنیوی سلطنت خارج کو معاف کر سکتی ہے، بڑے بڑے جرائم درگز کر سکتی ہے، رعایا کے ساتھ نہایت رفق و ملاطفت کا برداشت کر سکتی ہے، لیکن وہ کسی بخواہ سلطنت کے معمولی سے اغراض نہیں برداشت کر سکتی، عہد نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض

ابوداؤد، کتاب الحدود، باب فی اقامۃ الحد علی المريض: ۴۴۷۲۔

ایضاً، باب فی بصیب الرجل ما دون الجماع: ۴۴۶۸ و صحیح بخاری، کتاب الحدود: ۶۸۲۳۔

ابوداؤد، کتاب الديات، باب الامام يأمر بالعفو في الدم: ۴۵۰۳۔

ایسے کام کیے جن سے بظاہر جنگی وسیاسی امور کو نقصان پہنچ سکتا تھا، مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انہوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہو چکی تھی، حاطب بن جتبع رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، انہوں نے کفار قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے اللہ، اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردان اڑا دوں، لیکن آنحضرت ﷺ نے حاطب سے پوچھا کہ ”تم نے ایسا کیوں کیا؟“ حاطب نے کہا اللہ کی قسم! میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل و اولاد کو چھوڑ کر جو مهاجرین چلے آئے ہیں، ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے، لیکن میرے بال پہلوں کا وہاں کوئی سہارا نہ تھا، اس لیے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کر دوں جس کے بد لے میں میرے بال پہلوں کی حفاظت ہو جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”جی کہتے ہیں، ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو، بدگمانی کو راہ نہ دو۔“ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ اس نے اللہ اور اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ اس کی گردان اڑا دوں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا وہ اہل بدر سے نہیں ہیں، کوئی بات تو ہے جس کی بنا پر اللہ نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے:

((اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَّهْتُ لِكُمُ الْجَنَّةَ))

”جو چاہو کرو، کیونکہ جنت تمہاری قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔“

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈ بانگیں اور کہا کہ اللہ کے رسول کو سب سے زیادہ علم ہے۔ آنحضرت ﷺ نے حاطب بن جتبع رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں جو طرز عمل اختیار فرمایا وہ شرکت بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی، اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جس کو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ سیاست کا ایک لازمی جزو بدگمانی ہے اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدد بر اور دنیوی خیال کیا جاتا ہے جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپائے، لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کا ہے اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و حکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا، لیکن اخلاقی اور رذہ بھی سلطنتوں میں تمام تردار و مدار اخلاقی بال اللہ، باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوص اعتماد کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے حاطب بن جتبع کے جرم سے چشم پوشی کی، آنحضرت ﷺ نے اس اصول کو ان محضرا الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

* بخاری، کتاب المغازی، باب فضل من شهد بدرًا۔ ۳۹۸۳۔

((حسن الظن من حسن العبادة)) ﴿١﴾

”حسن ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔“

قرآن مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے:

﴿إِنَّ بَعْضَ الظَّلَمِ إِنَّمَا﴾ (٤٩ / الحجرات: ١٢)

”بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔“

آنحضرت ﷺ نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے:

((إِنَّ الْأَمِيرَ إِذَا أَبْتَغَى الرِّبَيْةَ فِي النَّاسِ افْسَدَهُمْ)) ﴿٢﴾

”جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو برپا کر دے گا۔“

اور عملی سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

عن معاویہ قال سمعت رسول اللہ ﷺ يقول: ((انك ان اتبع عورات

الناس افسدتهم أو كدت ان تفسد هم)) ﴿٣﴾

”حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اگر تم لوگوں کے جرائم کی کوئی

میں رہے تو تم نے یا تو ان کو برپا کر دیا ہے یا عنقریب برپا کر دو گے۔“

چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قائم رہا، تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا
حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی ذرا سی سے
شراب پیکتی ہے، لیکن چونکہ انہوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس لیے فرمایا کہ ہم کوئوں
لگانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ البته جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذه کرتے ہیں۔ ﴿٤﴾

دھیمن حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ صحابی کے مشی تھے، انہوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے
شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا، وہ لوگ باز نہیں آئے، اب ان کے لیے پولس کو بلاتا ہوں، حضرت
عقبہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ”درگزر کر“ دھیمن نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترک شراب سے انکار کرتے ہیں، میں
پولس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے پھر فرمایا کہ ”درگزر کر“ کیونکہ میں نے آنحضرت ﷺ سے شاہے کہ

((من رای عورۃ فسٹرہا کان کمن احیی موعودة)) ﴿٥﴾

”جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھپا لیا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے، جس نے ان لڑکوں کو
موت سے بچالیا، جوز نہ درگور کر دی جاتی ہیں۔“

﴿١﴾ ابو داود، کتاب الادب، باب فی حسن الظن: ٤٩٩٣۔ ﴿٢﴾ ابو داود، کتاب الادب، باب فی التجسس: ٤٨٨٩

﴿٣﴾ ابو داود، کتاب الادب، باب فی التجسس: ٤٨٨٨۔ ﴿٤﴾ یہ تمام حدیثیں ابو داود، کتاب الادب،

باب فی التجسس: ٤٨٩٠۔ ﴿٥﴾ ابو داود، کتاب الادب، باب فی الستر علی المسلم: ٤٨٩١۔

اُخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کام نہیں ہو سکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ ابھن خلدوں نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لیے مضر ہے اور اس کو اکثر بر باد کر دیتا ہے، اس مضمون میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمام ترا اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قولِ نبوی میں ملتا ہے، اس لیے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے اس مضمون کا غالباً تقلیل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

”جانا چاہیے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن، ذیل ڈول، وسعت علم، حسن خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے وہ شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے، سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور گران ہے، اس لیے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہوا اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہے اس نسبت سے جو صفت مستحب ہوتی ہے، اسی کا نام بادشاہی ہے، پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے اگر وہ برقی اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لیے مضر ہے اور ان کی بلا کست کا سبب ہے، سلطان کی خوبیوں کا تمام تر دار و مدار زمی پر ہے، کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو، بخت گیر ہو، لوگوں کے معائب کی کرید کرے، ان کے چرامنگ کو ایک ایک کر کے گئے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے اور لوگ ان سے بچنے کے لیے جھوٹ اور مکروہ فریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بہن جاتی ہیں اور بھر ان کا ضمیر اور نظام اخلاق بر باد ہو جاتا ہے، وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پبلو ہی کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت بر باد ہو جاتی ہے اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو جذبہ محبت بالکل مٹ جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ زمی کرے، ان کے گناہوں سے درگزر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں، پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے، سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم و توامیں چند چیزیں اور بھی ہیں، مثلاً: ان پر احسان کرنا اور ان کی معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی زمی ہے اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، جانا چاہیے کہ یہ لوگ بیدار مغزاً اور تیز ہم ہوتے ہیں، ان میں زمی بہت کم پائی جاتی ہے، زمی اکثر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے، بیدار مغزاً لوگوں کی نگاہ چونکہ دور رہ ہوتی ہے اور وہ ابتداء ہی سے انجام کا کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس لیے لوگوں کو تکلیف مالا بیطاق دیتے ہیں

جس کا تینجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں، اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روشن اختیار کرو اور حاکم کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو، چنانچہ حضرت عمر بن الخطاب نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انہوں نے کہا: کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمر بن الخطاب نے جواب دیا کہ یہ کچھ نہیں، میں نے تم کو صرف اسی بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہاری عقل کا بوجھہ ظالماً نہیں چاہتا۔*

ابن خلدون نے ان خطروں میں جو آئینے جہاں بانی پیش کیا ہے، اس پر اگر چہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جاسکتا ہے، لیکن اس طرزِ عمل کا جود و سراپہلو ہے یعنی یہ کہ اس نزدیکی کے برداشت سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پرواہی اور احکام سلطنت کے عدم تعقیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے اور ضعیف حکمرانوں کی نزدیک سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخلیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر مذہبی ہے، اس میں امیر کے احکام کی احاطت اللہ کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو قانون شریعت کے اس پہلو یعنی نزدیکی سے کام لیا جائے، جس سے لوگوں میں امن و اطمینان پیدا ہو، جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو۔ عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر و غریب اور اوپرے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہوں، مجرموں کو اس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے، اثبات جرم میں شکوک و شبہات کے موقع پر جرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سُنگد لی کی ان تمام سزاوں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں، ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے، چنانچہ فرمایا:

((اَنَّ اللَّهَ يَعِذِ الَّذِينَ يَعْذِبُونَ فِي الدُّنْيَا))

”بے شہزادان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔“

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم و ستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت ﷺ کا فیض صحبت اٹھایا تھا، انہوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حرام کا گزر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند بھلی دھوپ میں کھڑے کیے گئے تھے، انہوں نے اس کی وجہ پوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزاوی گئی ہے، انہوں نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے تباہ کیا کہ ”اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔“ دنیوی حکمران لطف و محبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں، غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ

* مقدمہ ابن خلدون فصل فی ان ارهاف الحد مضر بالملک، ص: ۱۵۷، ۱۵۸۔

* مسلم، کتاب البر والصلة، باب الوعید الشدید لمن عذب الناس بغیر حق: ۶۶۵۷ تا ۶۶۶۰۔

ظالمانہ ہوتا ہے، لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوموں کے آدمیوں پر ظلم کیا جا رہا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام سلطنت کی خارجی اثر سے اصول پر قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف و محبت اس کا خیر تھا اور اس لیے یہ اپر کرم ہر قوم کے سر پر سایہ افکن تھا، معاملات حکومت میں خود آپ ﷺ کا طرز عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کر دیں گے، مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت ﷺ کے اس فیاضانہ طرزِ عمل کا اعتراف تھا، چنانچہ یہودیوں میں دو مردوں عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہیے کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں، ﴿لَعْنَةُ سَرَّاً مِّنْ زَرْبِيْ بُرْتَ سَكَّتَهِ﴾۔

ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا سخت ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے، آپ ﷺ نے پوچھا: ”کیا وضو کر کے چلے تھے؟“ اس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا ”کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟“ اس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ”جاؤ اللہ نے معاف کر دیا۔“ لوگوں کے حوالج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لوٹی بھی جہاں چاہتی آپ ﷺ کو اپنے کام کے لیے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی، ایک محبوب الحواس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم اپنے کام کے لیے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں۔“ چنانچہ آپ ﷺ اس کے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دے دیا۔ ﴿عَدِیٌّ بْنُ حَاتِمٍ بَلَى اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ جَوْنَدٌ بْنُ نَصَارَىٰ أَوْرَطَ كَرْمَىٰ كَمْ تَحْكُمْ أَوْرُوْيِي در باروں میں رہ چکے تھے، جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو ان کو شک تھا کہ آیا حضور ﷺ بادشاہ ہیں یا نبی ہیں، لیکن جب ان کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گزرا تو کہہ اٹھئے کہ حضور ﷺ بادشاہ نہیں کیونکہ یہ حسن خلق تو نبی ہی میں پایا جاسکتا ہے اور اس کے بعد فوراً آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

متعدد واقعات اور ایسے گزر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بے باکی کے ساتھ سوال و جواب کرتے تھے حضور ﷺ ان کے ساتھ رفق و ملاحظت کا برداشت کرتے تھے، ایک بدو نے ایک دفعہ آپ ﷺ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطا یہ دیا، ﴿بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہو جاتے تھے جن کے لیے ان کو مالی کفارہ

۱۔ ابو داود، کتاب الحدود، باب فی رجم البهودین: ۴۴۵۰۔ ۲۔ ابو داود، کتاب الحدود، باب فی الرجل یعترف بحد ولا یسمیه: ۴۳۸۱: جو سوران سے ہوا تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا، اس لیے الحکم ان الحستانات یا ذہنیں السیستانات اس قصور کی معانی کی خوشی خبری دی گئی۔

۳۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب فی قربه مقتبل من الناس: ۶۰۴۔

۴۔ بخاری، کتاب الادب، باب التبسم والضحك: ۶۰۸۸۔

ادا کرنا ضروری ہوتا تھا، لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے تو آنحضرت ﷺ بیت المال سے ادا فرمادیتے تھے ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہو جائے۔ اس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انہوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کر لیا، ۲ لیکن آخراً ایک ۳ رات کو بے قابو ہو کر بیوی سے مباشرت کر لی، صبح کو گھبرا کر انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تھا آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر جرم کا اعتراف کیا، آپ ﷺ نے دوبار فرمایا: ”کیا تم نے ایسا کیا؟“ انہوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی: ہاں، ہاں، یا رسول اللہ! مجھہ ہی سے یہ حرکت ہوئی اور اب اللہ کا جو حکم ہواں کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں، فرمایا: ”ایک غلام آزاد کر دو۔“ انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یا رسول اللہ! اس گردن کے سوات تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”مستغل دو مہینے کے روزے رکھو۔“ عرض کی: یا رسول اللہ! جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق بھجو رو۔“ عرض کی: یا رسول اللہ! ہم نے تو خورات فاقہ سے برسی ہے، آپ ﷺ نے ان کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ ”صدقہ بنوزریق کے عامل کے پاس جاؤ، وہ تم کو اس قدر بھجو یں دے دے گا اس میں سے ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو نجک رہے وہ اپنے بچوں کو کھلاؤ۔“ وہ پڑھنے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمہارے بیہاں تیکی و بد تدبیری اور رسول اللہ ﷺ کے بیہاں و سعث اور مشورہ تیک پایا۔ ۴

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم ﷺ کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دو گونہ جذبے نے رعایا میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس قدر شفیقی پیدا کر دی تھی جس کی جھلک سلطانی دنیوی کے تاج ہائے مرصع اور ان کے لباس ہائے فاخرہ میں نظر نہیں آ سکتی، عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خود سری اور سرکشی کی جو دستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظام سلطنت کبھی قائم ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظام سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کیے گئے تو ان ہی خود سر، سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوش عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا، اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہد نبوت میں پیش آئے، ایک دفعہ ایک بدو بندج سے جل کر مددینہ آیا، سفر سے پریشان، بال اٹھنے ہوئے اور اسی حالت میں خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوا اور شریعت کے احکام پوچھنے، فرمایا: ”دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں۔“ عرض کی: کچھ اور

تمہارے لازم آتا ہے۔ ۵ اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نامنازل نہیں ہوا تھا۔

۶ ابو داود، کتاب الطلاق، باب الظہار: ۲۲۱۳۔

نمازیں بھی؟ فرمایا: ”نبیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو۔“ پھر فرمایا: ”اور رمضان کے روزے؟“ سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟ فرمایا: ”نبیں، لیکن یہ کہ نفل رکھو،“ پھر زکوٰۃ کو ذکر فرمایا، اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟ فرمایا: ”نبیں، مگر یہ کہ تم خود انی مرضی سے دو،“ اتنا سوال وجواب کر کے یہ کہتا ہوا جلا کہ اللہ کی قسم! میں ان میں کمی و بیشی نہ کروں گا، یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: ”یہ شخص کامیاب ہو گیا اگر سچا نکلا۔“ *

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہ ﷺ میں حاضر تھے کہ ایک بد نے آ کر کہا: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ ﷺ کو اللہ نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا: ”اس نے سچ کہا،“ اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے،“ اس نے کہا: زمین اور پہاڑ کس نے بنائے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے،“ اس نے پھر کہا: ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟ فرمایا: ”اللہ عز وجل نے،“ اس نے کہا: اس اللہ کی قسم! جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا پہاڑ کو کھڑا کیا ان میں فائدے رکھے، کیا سچ سچ اللہ ہی نے آپ کو بھیجا ہے؟ فرمایا: ”ہاں۔“ اس نے پھر عرض کی کہ آپ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقوف کی نمازیں ہیں اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے؟ فرمایا: ”اس نے سچ کہا،“ کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا، کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا: ”ہاں! سچ کہا،“ اس شک۔ ”پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے؟ فرمایا: ”ہاں! سچ کہا،“ اس نے کہا: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو رسول بنایا، کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ”ہاں۔“ پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہوتا خانہ کعبہ کا حج کریں۔ فرمایا: ”ہاں، سچ کہا۔“ عرض کی: اس کی قسم جس نے آپ کو بھیجا، کیا اللہ نے اس کا حکم دیا؟ فرمایا: ”ہاں،“ اس نے عرض کی: قسم ہے اس کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان احکام کی قبیل میں کچھ گھٹا بڑا نہیں کروں گا، ارشاد ہوا: ”اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہو گا۔“ *

ایک اور مجلس میں صحابہ حاضر خدمت تھے اور حضور ﷺ نیک لگائے تشریف فرماتے، اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور سوار ہی مسجد میں داخل ہوا، پھر اونٹ سے اڑا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا، پھر جمع کے پاس آ کر پوچھنے لگا، تم میں محمد ﷺ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ وہ گورے آدمی جو نیک لگائے بیٹھے ہیں، اس نے کہا کہ اے عبد المطلب کے بیٹے! حضور ﷺ نے فرمایا: ”ہاں کہو۔“ اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں گا اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا، فرمایا: ”جو چاہو پوچھو۔“ اس نے کہا: میں تمہارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنایا کر بھیجا ہے؟

* بخاری، کتاب الایمان، باب الزکوٰۃ م: الاسلام: ۶۔

* صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب السؤال عن اركان الاسلام: ۱۰۲۔

فرمایا: ”خدایاہاں۔“ پھر فرمایا: اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ و تینوں کی نماز پڑھیں؟ فرمایا: ”خدایاہاں۔“ پھر کہا: اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینے کاروزہ رکھیں؟ فرمایا: ”خدایاہاں۔“ پھر کہا: اللہ ہی کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانت دیں؟ فرمایا: ”خدایاہاں!“ اس نے کہا: میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لے کر آپ ﷺ آئے ہیں، اپنے پیچے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں، میں ضام بنتلبہ ہوں۔ ❶

ذرا اس سادگی، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منفرد یکھنے اور شفیقگی و جان ثاری کا ایک اور اقتدار ہے۔

خیر! یہ واقعات تو ان بداؤں کے حضور انور ﷺ کے ساتھ پیش آئے، صحابہ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت ﷺ کے جانشیر تھے، وہ بھی اگر ان بداؤں کی طرف سے گزرے تو ان کے ساتھ بھی انہوں نے اسی محبت کا ثبوت دیا، براء بن عازب ﷺ ایک صحابی تھے ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا، وہ اس کو ڈھونڈنے نکل کر بداؤں میں پہنچ گئے، بداؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضور کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھوم کر شاری ہونے لگے۔ ❷

رعایا کی وفاداری، غلوص، جوش عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدان جنگ ہے، آنحضرت ﷺ کی زندگی کا بڑا حصہ میدان جہاد ہی میں بسر ہوا ہے، صحابہ نے جس جوش کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ہے اور جس غلوص کے ساتھ آپ ﷺ پر مسلسل کھڑے ہوئے تھے، عروہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپ کی ڈاڑھی پکڑ لیتے تھے، لیکن جب ان کا ہاتھ آپ کی ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا، مغیرہ نوار کے قبضے اس پر ٹھوک مار کر کہتے کہ آپ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو، عروہ نے اس جوش عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہ ﷺ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کا العاب دہن بھی گرتا تھا تو لوگ تبر کا اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے تھے۔ جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لیے سبقت کرتا ہے، جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبر کا لینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ ادب اور تقطیم سے آپ ﷺ کی طرف نگاہ جما کرنیں دیکھ سکتے، وہ اس منظر جاہوجلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں

❶ بخاری، کتاب العلم، باب القراءة والعرض على المحدث: ٦٣۔

❷ ابو داود، کتاب الحدود، باب فی الرجل بزني بحریمه: ٤٤٥٦۔

اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر و سری اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہوں، جس قدر محمد کے اصحاب محمد ﷺ کی تعظیم کرتے ہیں، جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپ ﷺ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لیے پیش دیتی کرتا ہے۔ جب آپ ﷺ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لیے لڑتا ہے۔ جب آپ ﷺ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ تعظیماً آپ ﷺ کی طرف نگاہ جما کر دیکھنیں سکتے۔

غزوہ بدرا کے متعلق جب آپ ﷺ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے جونقرے نکلے وہ جوش، خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے، انہوں نے کہا:

ایانا ترید یار رسول اللہ! والذی نفسی بیده لوا مرتنا ان نخیضها البحر

لاخضناها ولو امرتنا ان نضرب اکبادها الی برک الغمامad لفعلنا. ۲

”یار رسول اللہ ﷺ! کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر آپ کا حکم ہو کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغمامad پر دھاوا کریں تو ہم کر دیں گے۔“

غزوہ احد میں جب آپ ﷺ نے کفار کی جمعیت کو ذرا گرد بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے جن الفاظ کے ذریعے سے آپ کو روکا، اس سے زیادہ جوش محبت کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے، انہوں نے کہا:

بابی انت و امی لا تشرف يصبك سهم من سهام القوم نحری دون نحرک. ۴

”میرے باپ ماں آپ ﷺ پر قربان، آپ گرد بڑھا کرندیکھئے کہیں آپ کو کوئی تیر نلگ جائے، میرا سینہ آپ کے سینہ کے سامنے ہے۔“

خیریہ تو صحابہ اور حضور انور ﷺ کے درمیان کے واقعات تھے، آنحضرت ﷺ کے محبت یا نتے یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے تو ان کی محبوبیت کا بھی عالم تھا۔ چنانچہ غیر قوموں کو عمال نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں، فتح نیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقییم کے لیے آپ ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، وہ وہاں گئے اور تختینہ کر کے ہر کھجور کے درخت

۱ بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحة: ۲۷۳۲، ۲۷۳

۲ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب غزوہ بدرا: ۴۶۲۱۔ ۳ یہیں کی سمت میں ایک مقام کا نام۔

۴ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ احد: ۴۰۶۴۔

سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی، اس پر یہودیوں نے کہا: ”یہ تو بہت ہے“۔ انہوں نے کہا: اچھا! میں تحریک کر دیتا ہوں، تم لوگ اس کا نصف لے لینا، اس انصاف پسندی سے یہوداں قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکارا تھے:

هذا الحق وبه تقوم السماء والارض قدر رضينا ان نأخذه بالذى قلت.
”النصاف اس کا نام ہے اور اسی انصاف سے آسمان وزمین قائم ہیں جو کچھ تم نے کہا تم اس کے قبول کرنے پر راضی ہیں۔“

فتح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دیتا چاہی، لیکن انہوں نے کہا: اے اللہ کے شمنو! تم مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو، اللہ کی قسم! میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں، جو محظوظ ترین خلائق ہے اور تم کو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں لیکن تمہاری دشمنی مجھ کو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی، یہ سن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان وزمین اسی انصاف سے قائم ہیں۔ ②

١ ابو داود، کتاب البيوع، باب فی المساقاة: ۱۰، ۳۴۔

٢ فتح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ، ص: ۳۱۔

سلطنت اور دین کا تعلق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو نہ ہب سے قطعاً علیحدہ رکھا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قصر کا ہے وہ قصر کو دو اور جو اللہ کا ہے وہ اللہ کو دو، اس تعلیم میں قیصر اور اللہ دو مقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دینا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاقی نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں نہ ہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن نہ ہب کی طفیل و نازک روح کو سلطنتی تو انہیں آئیں وضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ نہ ہب کی لاطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اصل دینِ الٰہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے اور ازال سے اب تک ایک ہی رہے گا اور وہ اسلام ہے، «إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْأَسْلَامُ» (آل عمران: ۱۹) ”اللہ کے نزد یک دین اسلام ہے۔“ اس دین کی جامیعت کی تشریع مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جاسکتی ہے، انہی میں سے ایک پہلو یہ ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتقد جسموں ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ دین ہے یا ایسا دین ہے جو سرتاپ سلطنت ہے، مگر سلطنتِ الٰہی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلطنتِ الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے، وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے، جل شانہ و تعالیٰ اسمہ بادشاہ اسی کی ہے، حکم اسی کا ہے فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے۔ دوسرے مجازی حاکموں اور آمرلوں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکمِ الٰہی ہو، یا اس کا منی ہو اور کم از کم یہ کہ اس کے خلاف نہ ہو، آنحضرت ﷺ اس دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور تغیرتھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرمزا و اتحہ، آپ ﷺ کے احکام کی بجا آ دری عین احکامِ الٰہی کی بجا آ دری ہے:

『مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ』 (النساء: ۸۰)

”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“

آپ ﷺ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ ﷺ کے جو جانشین اور خلفاء ہوئے، ان میں بھی دین و دنیا کی تباہی جامیعت تھی، وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرمزا و اتحہ، اسی طرح وہ دین کے پیشووا، امام اور مجتہد تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں، ہر مسلمان پر واجب

۱۰- میں کوئی بھائی نہیں تھا۔

(ص: ۲۴-۲۶)

”اور داؤ نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی اللہ نے) ان کو آزمایا ہے، تو اپنے پروردگار سے انہوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے، اے داؤ! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستے سے ہٹا دے گا۔“

آگے بیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و ظلم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤ عليه السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے اللہ کی عبادت میں مصروف رہنے لگے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسب احکام الہی فرائض خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے۔

جامع ترمذی اور مسند رک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((ما من امام یغلق بابہ من ذوی الحاجة والخلة والمسکنة الا اغلق اللہ ابواب السماء دون خلته و حاجته ومسکنته)) * * *

”جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر لے گا۔“

((من ولی من امر المسلمين شيئاً فاحتجب دون خلتهم و حاجتهم و فقرهم و فاقتهم احتجب الله عزوجل يوم القيمة دون خلته و فاقته و فقره)) *

”جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی ضرورت کے وقت اوث میں ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوث میں ہو جائے گا۔“

خلافے راشدین رض نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ انہوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لئے نہیں کھڑی کی اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لیے اجازت حاصل کرنے والے غلاموں رض کے سوا کوئی اوث قائم نہیں کی، حضرت عمر رض کے زمان میں حضرت سعد بن ابی و قاس رض

* جامع ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی امام الرعیة: ۱۳۳۲۔

* مسند رک حاکم، کتاب الاحکام ۴، جس ۹۴، ۹۳۔

* چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لیے اذن کا حکم ہے، اس لیے خود آنحضرت ﷺ نے اور خلفاء نے گھروں کے دروازوں پر نوک متعین کر رکھے تھے، مگر عام پلک مقامات، مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی۔

نے جو کونہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لیے ایک محل بنایا اور اس میں پھاٹک لگوایا، جب حضرت عمر بن الخطابؓ کو اس کی خبر پہنچی تو انہوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمد بن مسلمہ ؓ کو اس لیے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے اور پہنچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگادی، حضرت سعد بن ابی و قاص ؓ نے ان کو اپنے پاس تھہرانا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور سیدھے مدینے واپس چلے آئے۔ ﴿

حضرت امیر معاویہ ؓ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک نوک قائم کی اور ایک صحابی نے ان کو اس حکم نبوی سے باخبر کیا تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا جو اہل حاجت پہنچ تو اس کی ضرورت سن کر ان کو مطلع کر دے۔ ﴿
قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائض حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں:

﴿أَن تُؤْمِنُوا إِلَى أَهْلِهَا۝ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعُدْلِ۝ إِنَّ اللَّهَ يُعِظُّ
يُعَظِّمُ رِبَّهُ۝ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَآتِيْعُوا الرَّسُولَ
وَأُولَئِكُمْ أَمْرِيْمَنْمَ۝ فَإِن شَنَّاكُمْ عُنْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرْدُوْهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُلُّمُنْ تُؤْمِنُونَ
بِاللَّهِ وَاللَّهُوَ الْيَوْمُ الْآخِرُ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَخْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ (٤ / النساء: ٥٨-٥٩)

”امانت والوں کی انسقیں ان کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو، اللہ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بیشک اللہ سنتا (اور) دیکھتا ہے، ہم منو! اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو کوئی تم میں صاحب حکومت ہیں، ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا تماں بھی اچھا ہے۔“

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی آیت پاک کا پہلا نکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہل تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے اور یہ بات کہ کہہ رہ صاحب حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے۔

﴿وَأَقِيمُوا الْوُزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ﴾ (٥٥ / الرحمن: ٩)

”اور قول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو اور میزان میں کمی نہ کرو۔“

یہ اور اسی معنی کی اور آئیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف بردا جائے اور جس پیش سے تم دوسروں کے لیے تلتے ہو، اسی پیانے سے اپنے لیے بھی تو لو:

﴿ وَيُلِّي لِلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَنْتُمْ عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْزَرُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۝ ﴾ (۸۳ / المطففين: ۱ - ۳)

”پھکار ہوان توں میں بے ایمانی کرنے والوں پر جو لوگوں سے قول کر لیں تو پورا پورا میں اور جب ان کو ناپ کریا توں کر دیں تو گھٹادیں۔“

یہ قول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے اور خلاف انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا، اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ ﴾ (۵ / المائدۃ: ۴۲ و ۴۹ / الحجرات: ۹)

”اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے:

﴿ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ ﴾ (۲ / آل عمران: ۵۷ ، ۱۴۰)

”اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

﴿ إِنَّكُمْ لَا يُحِبُّ الطَّالِبِينَ ۝ ﴾ (۴۲ / الشوریٰ: ۴۰)

”بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔“

ظلم کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہیے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا اللہ تعالیٰ کا ہو، ان آئیوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے بخوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور بخوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکامِ الہی کے تحت ادا ہوں:

﴿ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَسِيْقُونَ ۝ ﴾ (۵ / المائدۃ: ۴۷)

”اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔“

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے:

((الا ایہا الناس لا یقْبِلُ اللَّهُ صَلَوةً امام حکم بغير ما انزل اللَّهُ))

”ہاں اے لوگو! جو امام، اللہ نے جو قانون اتارا ہے اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے، اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔“

مستدرک، کتاب الاحکام، ج ۴، ص ۸۹

سب طاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتكب ہوتا ہے، وہ منافق ہے اور اس لیے اس کی نماز یعنی اظہار اطاعت بارگاہِ الہی میں بے معنی ہے۔ اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیش نظر کھنا چاہیے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و فرماؤں کی ایک مذہبی فریضہ ہے، جو لوگ اس فریضہ سے حسب احکامِ الہی بخوبی عہدہ برآ ہوں، ان کے لیے آخرت میں رحمتِ الہی کا سایہ ہے اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں ان کے لیے وہ سزا میں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لیے مقرر کی گئی ہیں، فرمایا:

((الامام الذى على الناس راع هو مسئول عن رعيته))

”وَهُوَ إِمامُ جُوْلُوْغُوْنَ پُرْ مُقْرِرٌ هُوَ وَهُوَ مُكْرِرٌ كَارٌ هُوَ، اس سے اس کے زیر نگرانی اشخاص کے متعلق باز پرس ہوگی۔“

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسلامی امارت و خلافت تاج و تخت کی بھار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں، ذمہ داریوں کا خارزار ہے، جو اس سے بسلامت گزر گیا، اس کے لیے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آرائش ہے اور جو اس میں الجھ کرہ گیا، وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و بد نام ہو گا اور آخرت میں بھی رسو او خوار ہو گا۔

((ما من عبد يسترعى الله رعية فلم يحيطها بنصحه الالم يجد رائحة الجنة))

”جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا گلگران بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری پوری نہ کرے تو وہ جنت کی بھی نہ پائے گا۔“

حضرت معقل بن يسار رض ایک صحابی تھے، ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبد اللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا، انہوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمہیں حضرت رسول اللہ ﷺ کا ایک پیغام سنار بنا چاہتا ہوں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ ستاتا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنائے:

((ما من عبد يسترعى الله رعية يموت يوم يموت وهو غاش لريعته الاحرم

الله عليه الجنة))

”جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا گلگران بنائے، وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔“

اس سے اندازہ ہو گا کہ امارت و حکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے، ایک اور صحابی

۱ صاحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ: اطیعوا اللہ...: ۷۱۳۸۔

۲ ايضاً، باب من استرعى رعية فلم ينصح: ۷۱۵۰۔

۳ صاحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضیلۃ الامیر العادل...: ۴۷۲۹۔

جن کا نام عائد بن عمر رضی اللہ عنہ ہے، وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے، عبد اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے ہیں اور اس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنائے:

((ان شر الرعاء الحطمة)) ﴿۱﴾

”سب سے برائی (امیر) وہ ہے جو اپنے رعیت کو توڑا لے۔“

تو تو ان میں سے نہ بن، اس نے کہا: آپ محمد ﷺ کے اصحاب میں بھوسی ہیں، فوراً بولے، کیا حضور ﷺ کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا، بھوسی تو اوروں میں تھے اور ان کے بعدواں ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ”بنی اسرائیل کی سیاست انیافر میا کرتے تھے، ایک نی گز رجاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا، نبوت مجھ پر ختم ہو گی، البتہ خلفا ہوں گے اور بہت ہوں گے، انہی کے ہاتھ میں امت کی بیانگ ہو گی۔“ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! تو ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا: ”پہلے کی بیعت کرو، پھر اس کے بعد وا لے کی، پھر عبد بے عہد اوروں کی، ان کا حق ان کو ادا کیا کرو۔“ (یعنی اپنے حق کی پر ش اللہ پر چھوڑو)

((فَإِنَّ اللَّهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا أَسْتَرَ عَاهُمْ)) ﴿۲﴾

”کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق باز پرس فرمائے گا جن کی نگرانی اس نے ان کے پرورد فرمائی ہے۔“

حضور ﷺ نے اپنی امت کے امراء کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے:

((اللَّهُمَّ مِنْ وَلَىٰ مِنْ أَمْرَأَتِي شَيْئاً فَشَقَّ عَلَيْهِمْ فَاشْقُ عَلَيْهِ وَمِنْ وَلَىٰ مِنْ

أَمْرَأَتِي شَيْئاً فَرُفِقْ بِهِمْ فَارْفِقْ بِهِ)) ﴿۳﴾

”اے اللہ! جو کوئی میری امت کی کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا اور جوان سے مہربانی سے چیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرمانا۔“

حضور ﷺ کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لے کر ادنیٰ افسریک شامل ہیں اور ہر ایک پر اپنے اپنے وزراء حکومت کی ذمہ داری عائد ہے، ایک اور حدیث پاک میں اس وزراء کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے:

((اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رِعْيَتِهِ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَىٰ اهْلِ بَيْتِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْهُمْ وَالمرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَىٰ بَيْتِ بَعْلَهَا وَوَلَدَهُ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ وَالْعَبْدُ

﴿۱﴾ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضیلۃ الامیر العادل: ۴۷۳۳۔ ﴿۲﴾ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبياء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل: ۳۴۵۵۔ ﴿۳﴾ صحیح سلم، کتاب الامارة، باب فضیلۃ الامیر العادل: ۴۷۲۲۔

راع علی مال سیدہ و هو مسئول عنه الا فکلکم راع و کلکم مسئول عن
رعيته) ﴿

”ہاں! تم سب نگران کا رہوا در تم سب سے اپنے زیر گرانی اشخاص و رعایا کی بابت پوچھ ہو گی تو لوگوں کا امیر نگران کا رہے اس کے زیر نگران کے متعلق پرسش ہو گی اور مرد اپنے گھروں کا نگران کا رہے اور اس سے اس کے گھروں کی پرسش کی جائے گی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگران ہے، اس سے ان کے متعلق سوال ہو گا اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے، اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا تو ہاں ہوشیار ہو، تم سب نگران کا رہوا در تم سے اس کے زیر نگران کے بابت باز پرس کی جائے گی۔“

لفظ رعیت

اس موقع پر خصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے، جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے اور وہ رعیت ہے اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہو گئی ہے، حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں، یہ الفاظ لفظ ”رعی“ سے نکلے ہیں، جس کے اصل معنی جانوروں کے چڑانے کے ہیں، راعی چڑاہا اور رعیت وہ ہے جس کو وہ چڑائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے، اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے، جس کی تربیت و پرورش نگرانی اور حفاظت کی رائی و محافظت کے پرداز ہو تو درحقیقت ایک امیر کی حیثیت ایک شفیق و محافظ چڑاہے کی ہے، جو اپنے گلے کو سر بزر چراگا ہوں میں لے جاتا ہے اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے۔ اس تشریع کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور علیہ السلام کی زبان مبارک پر لفظ ”رعیت“ کس قدر شفقت آمیز اور پرمخت معنوں میں آیا ہے اور ظالم و سفاک امر اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں عمل اس تعامل کر رہے ہیں حالانکہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا فقر پوشیدہ ہے، جو امام عادل اپنے فرائض سے بخوبی عبد برآ ہوں گے، رسول اللہ علیہ السلام۔ نہ ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے:

((ان المقططین عند اللہ، علی منابر من نور عن یمین الرحمن و کلتا یدیه

یمین الذین یعدلون فی حکمہم و اهلیہم و ما لوا)) ﴿

”بے شک انصاف کرنے والے (حاکم و امراء) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے اپنے لوگوں میں اور اپنے زیر حکومت امور میں عادل ہوں۔“

﴿ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ: اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول۔۔۔۔۔ ۷۱۳۸: صحیح

مسلم، ایضاً: ۴۷۲۴۔ ﴿ صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب فضیلۃ الامیر العادل: ۴۷۲۱۔

اس رفتہ اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی، ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے، جامع ترمذی میں ہے:

((اَنْ اَحَبُّ النَّاسَ إِلَى اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَادْنَاهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا اَمَامٌ عَادِلٌ وَابْغُضُ
النَّاسَ إِلَى اللَّهِ وَابْعَدُهُمْ مِنْهُ مَجْلِسًا اَمَامٌ جَائِرٌ)) ﴿١﴾

”بے شے سب لوگوں سے اللہ کو محبوب اور اللہ سے قریب امام عادل ہوگا اور اللہ کے نزدیک سب سے مبغوض اور اللہ سے دورہ امام ہوگا، جو ظالم ہو۔“

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم و امیر عدل و انصاف اور عالمی پروری اور خیر خواہی سے دور ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے، فرمایا:

((مَا مِنْ اَمِيرٍ يَلِي اَمْرَ الْمُسْلِمِينَ ثُمَّ لَا يَجْهَدُ لَهُمُ الْاَلْمَيْدَنَ يَدْخُلُ مَعَهُمُ الْجَنَّةَ)) ﴿٢﴾
”جو امیر مسلمانوں کے کام کا ولی ہو، پھر وہ ان کے لیے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں، وہ
ان کے ساتھ ہشت میں داخل نہ ہوگا۔“

((مَا مِنْ وَالِ يَلِي رُعْيَةً مِنَ الْمُسْلِمِينَ فِيمَا تَوَلَّ وَهُوَ غَاشٌ لَهُمُ الْاَحْرَمُ اللَّهُ
عَلَيْهِ الْجَنَّةُ)) ﴿٣﴾

”کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیر نگرانی جماعت کا ولی ہو، وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان
مسلمانوں کے ساتھ نداری کا مرتكب ہو، اس پر جنت حرام ہے۔“

((اَنَّمَا الْاَمَامُ جَنَّةٌ يَقَاتِلُ مِنْ وَرَاءِهِ وَيَتَقَى بِهِ فَإِنْ اَمْرَ بِتَقْوَى اللَّهِ وَعَدْلٌ فَإِنْ لَهُ
بِذَلِكَ اجْرًا وَإِنْ اَمْرَ بِغَيْرِهِ فَإِنْ عَلِيهِ وَزْرًا)) ﴿٤﴾

”امام و حال ہے اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے، تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے
مطابق حکم کرے اور عدل کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور
عدل نہ کرے تو اس کے لیے بڑی سزا ہے۔“

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امور دین کا
درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب و عذاب اور جزا اوسرا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے
امور و اعمال اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال و عبادات کے دوسرے

﴿١﴾ ترمذی، ابواب الاحکام، باب ماجاء فی الامام العادل: ۱۳۲۹۔

﴿٢﴾ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ: ۴۷۳۔

﴿٣﴾ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، باب من استرعى رعية فلم يتصح: ۷۱۵۱۔

﴿٤﴾ نسائی، کتاب البيعة، باب ذکر ما يجب للامام: ۴۲۰۱۔

شعبوں سے کم نہیں اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں، کیونکہ یہاں دین کے معنی احکام الہی ہیں یا قوانین الہی ہیں۔ یہ احکام الہی اور قوانین الہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے کیساں متعلق ہیں، اس بنا پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم و سُق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جزو ہے۔

ایک مدت سے علما کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہل علم اور اہل اتفاق کو کنارہ کش رہنا چاہیے، حافظ شیرازی کا مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے:

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش رموز مملکت خویش خسروان دانتند
اے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے، زیادہ شور و غل مت کر کے اپنی مملکت کے رموز و اسرار
بادشاہی جانتے ہیں، تم کو ان سے کیا سروکار!

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکام الہی کی تبلیغ اور اجراء کے لیے ہے اور یہ یعنی دین ہے، اسلام میں جس قیال و جہاد کی دعوت بر ملا دی گئی ہے اور جس پر آخری نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں اور جس سے دائی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مقدس اور حضراتِ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں، اس سے مقصود اصلی احکام الہی کی تبلیغ تعمید اور اجراء ہی تھا، جہاد سے فرار پر غضب الہی اور جہنم کی وعید ہے اور میدان جہاد کے صبر و ثبات پر صادق قدم اور ترقی ہونے کی بشارت ہے، قرآن میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيْمُ الَّذِينَ كَفَرُوا رَحْفًا فَلَا تُؤْلُمُهُمُ الْأَدْبَارُ وَمَنْ يُؤْلِمُهُمْ يُوْمَيْدُ دُبْرَةً إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقَاعًا أَوْ مُتَحَيَّزًا إِلَى فِتْنَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضْبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَا وَلَاهُ جَهَنَّمُ وَكَيْسُ الْمَصِيرُ﴾ (۸/ الانفال: ۱۵-۱۶)

اے اہل ایمان! جب میدان جنگ میں لفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیشہ نہ کچھ رہنا اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا لڑائی کے لیے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جامانا چاہے، ان سے پیشہ کچھ رے گا تو (سمجھو کو) وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا لٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بڑی جگہ ہے۔

﴿وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَجِئْنَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا طَوْأَلِكَ هُمُ الْمَتَّقِونَ﴾ (۲/ البقرة: ۱۷۷)

حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کا محل بھی ہو سکتا ہے کہ بنده کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار و مصالح کی تلاش نہیں کرنی چاہیے، جب کہ وہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز و مصالح سے غیر وہیں کرتے، اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کے جانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکام الہی کے رموز و اسرار کی تلاش و طلب نہیں کرنی چاہیے۔

”اور ختنی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کا رزار کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔“

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرام علیہم السلام جہاد و قیال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامتِ دین، تنفیذ حکم، امر بالمعروف اور نبی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا برا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور ضعیفوں سے متعلق ہے، عام عبادات و اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامتِ دین کی راہ میں خون شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور لگنا ہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے، حضرات صحابہ علیہم السلام ہر وقت جہاد و قیال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے:

﴿فَالَّذِينَ هَا جَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَيِّئِينَ وَقُتِلُوا وَقُتِلُوا إِلَّا كَفَرُوكُمْ

عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا دُخْلَنَّهُمْ جَنَّتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ تَوَآءِلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ طَوَّافُهُ

عِنْدَهُ حُسْنُ التَّوَابِ﴾ (آل عمران: ۱۹۵)

”تو جو لوگ میرے لیے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کیے گئے، میں ان کے گناہ دور کر دوں گا اور ان کو پیشوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہیں بہتر ہی ہیں (یہ) اللہ کے ہاں سے بدلا ہے اور اللہ کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔“

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، ان میں سے ایک معنی احکامِ الہی کی اطاعت، تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں، سورہ نور میں ہے:

﴿وَلَا تَأْخُذْ كُمْبِهِمَارَافَةً فِي دِيْنِ اللَّهِ﴾ (النور: ۲۴)

”اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آئے۔“

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین سے مقصود یہاں احکامِ الہی کی تنفیذ و اجراء ہے، اسی طرح سورہ بقرہ کی اس آیت میں:

﴿وَقْتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونُ النَّّاسُ يَلْتَهِطُونَ﴾ (آل بقرہ: ۱۹۳)

”اور ان سے اس وقت تک قیال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔“

صرف حکمِ الہی کی اطاعت کو ”دین“ فرمایا گیا ہے، سورہ انفال کی اس آیت میں:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونُ النَّّاسُ يَلْتَهِطُونَ﴾ (آل انفال: ۳۹)

”اور ان لوگوں سے قیال کرتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔“

بھی حکم و قانونِ الہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوانح کوئی اطاعت کے

لائق ہے اور نہ عبادت کے، اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ (إنَّ الْحُكْمُ لِإِلَهٖ طَوْبَةٍ) (٦/ الانعام: ٥٧ و ١٢ / يوسف: ٤٠) (أَلَا لَهُ الْحُكْمُ) (٦/ الانعام: ٦٢) ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصْبَاطُ﴾ (١٦/ التحلیل: ٥٢)

”اور اسی اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی لازمی اطاعت ہے۔“

یہاں بھی دین کے معنی احکامِ الہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور ظم قرآنی کے مطابق ہے۔

سلطنت و ملکیت کی حقیقت

اب دین کی تشریع کے بعد حکومت و سلطنت ولایت کی تھوڑی تشریع کی ضرورت ہے، عام لوگ حکومت و سلطنت کو عیش و تنعم کے لیواں زرنگار، تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زریں کمر بند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں، یا جلال و جبروت اور قہر و بیعت کی تواروں کے سامنے میں، لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس تعلیم کی جعلی مثال پیش کی ہے وہ ان تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیے

سلطنت و حکومت اور ولایت و ریاست کا راجح وقت تخلیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے سلطنت، حکومت اور بادشاہی و شہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں راجح تھے، قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، ایران کے شہنشاہ کسری اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے، مگر تعلیمِ محمدی ﷺ نے ان سب لفظوں سے جو جبر و قہر اور ظلم و ستم کے مظہر تھے، پرہیز کیا، الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے، اس لیے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا، اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے، چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے:

﴿فُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ إِلَهِ النَّاسِ﴾ (١٤/ الناس: ٣-١)

”کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی، لوگوں کے معبود برجت کی۔“

﴿الْمَلِكُ الْقَدُّوسُ السَّلَمُ﴾ (٥٩/ الحشر: ٢٣)

”بادشاہ حقیقی، پاک ذات (ہر عیب سے) امن و امان والا۔“

﴿فَكُلْ أَنَّهُ الْمَلِكُ الْحَقِّ﴾ (٢٣/ المؤمنون: ١١٦)

”تو خدا جو سچا بادشاہ ہے۔“

﴿الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (٦٢ / الجمعة: ١)

”بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست حکمت والا ہے۔“

یہ آیت قرآن پاک میں چھوپنے آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو ”الملک الحق“، یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے، یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے، ان آیتوں میں کہیں بھی تمہارا الملک نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اضافت ضرور لگائی گئی ہے، مثلاً اور پر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملک الناس ”لوگوں کا بادشاہ“ کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رب الناس ”لوگوں کا پالن ہاڑ“ بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی ربویت کا بھی اظہار ہو، دوسری آیت میں الملک کے ساتھ اول القدوں (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن و امان والا) کہا گیا، تاکہ اس کے ساتھ اس کی پاکی و سلامتی ظاہر ہو جائے، تیسرا آیت میں الملک کے ساتھ الحق (برحق) کی صفت آئی ہے، چوتھی آیت میں الملک کے ساتھ القدوں (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفت آئی ہے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے لفظ کے اندر قلم و سفا کی، قبر و جبرا اور بے رحمی و نخت دلی کا ایسا مفہوم ہے، ان انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے یہی اس لفظ کا استعمال کیا ہے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضروری لگا دی ہے۔

لفظ ملک الملوك کی مہماںگت

عربی میں ملک الامالک یا ملک الملوك اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی شاہ شہاب بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مباذا کے ساتھ پایا جاتا ہے، اسلام میں شاہ شہاب، شہنشاہ، ملک ملکوں صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، آنحضرت ﷺ نے صاف ارشاد فرمایا:

((اخنح الاسماء عند الله رجل تسمى ملك الامالك))

”سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔“

معانی جن الفاظ سے ادا کیے جاتے ہیں، اگر ان کی اصلاحیت محفوظ ہو تو معلوم ہو گا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت پھیپھی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اپنی طرز حکومت کے فرد عامل کا نام خلیفہ اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے، خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرمازوں نہیں، بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قائم مقام ہے؟

صحیح بخاری، کتاب الادب، باب بعض الاسماء الى الله: ٦٢٠٦

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ قرآن پاک اور تورات دو نوں صحقوں میں مذکور ہے، مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں، تورات میں یہ بیان صرف آدم علیہ السلام کے آغاز پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے، لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پھر ہے، اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلف ہوتا، اس کا اصلی مقام بہشت ہوتا، جزا و سزا کا راز، رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعین، دنیا میں اس کے فرائض، احکامِ الہی کی بجا آوری کی صورت اور اللہ کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ پہلی چیز اسلام کے اساسی عقائد ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں۔ *

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمُلْكَيْةِ إِلَىٰ جَاعِلٍ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۚ﴾ (۲۰/ البقرة)

”اور جب تیرے پر ووگارنے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“
یہ خلیفہ حضرت آدم علیہ السلام تھے، جو بنی آدم کے قاسم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے، اس لیے دوسرے موقعوں پر آدم علیہ السلام کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتر اور ممتاز فرمایا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرِمْتَنَا بِرَبِّنَا أَدَمَ وَحَسَنَتْهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَعْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كِبِيرٍ مِّنْ مَّنْ خَلَقْنَا لَقَضْيَلًا ۚ﴾ (۱۷/ بنی اسراء یہل)

”ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خلیفی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہتری مخلوقات پر بزرگی دی۔“
اور اسی شرف و امتیاز کی بناء پر آدم علیہ السلام بنی آدم کے قاسم مقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغہ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

﴿إِهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيُنَّكُمْ مُّقْرَبًا هُدًى فَمَنْ تَبَعَهُمْ فَلَا حَوْفٌ عَلَيْهِمُ وَلَا هُمْ يَحْزُنُونَ ۚ﴾ (۲/ البقرة)

”تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ، اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ راہنمائی آئے تو جو میری راہنمائی کی پیروی کریں گے، تو ان کو نہ کوئی ذر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔“

سورہ اعراف میں ارشادِ الہی ہے:

* خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات اور رجوع ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت اسلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے، یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔

﴿وَلَقَدْ مَكَّنْنَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشٍ طَقْلِيًّا مَا تَشْكُرُونَ ﴿٦٧﴾ وَلَقَدْ حَقَّنَا لَمَّا صَوَرْنَا لَكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلملِکَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ ﴿٦٨﴾ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْرِيزٌ لَمْ يَكُنْ مِنَ الشَّاجِرَاتِ ﴾٦٩﴾﴾ (الاعراف: ٦٧-٦٩)

”اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمہارے زندگی بسر کرنے کے معashi طریقے بنائے، تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشنا، پھر تمہاری صورتیں بنا کیں، پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے، کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔“

ان آئیوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بی آدم کے حصہ میں آئی، اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی، وہ پورے بی نوع آدم کو نصیب ہوئی، سورہ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلِيفَ الْأَرْضِ وَرَفِعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَسْلُوكُمْ فِي مَا أَشْكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾٦٥﴾ (الانعام: ٦٥)

”اور وہی (اللہ) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرا پر درجہ بڑھایا، تاکہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے بے شک تیرا پر و دگار جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بے شبہ بخشے والا ہم بران ہے۔“

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جائشی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا جائشین، بنایا:

﴿وَإِذْ رُوَا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمٍ تُؤْخِرُهُمْ ﴾٦٩﴾ (الاعراف: ٦٩)

”اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوح علیہ السلام کے بعد جائشی بخشی۔“

اور پھر شود کو عاد کا جائشین بنایا:

﴿وَإِذْ كُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ ﴾٧٤﴾ (الاعراف: ٧٤)

”اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد نیابت بخشی۔“

حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

﴿وَيَسْتَخِلُفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَ كُمْ ﴾١١﴾ (ہود: ١١)

”تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشے گا۔“

حضرت انور علیہ السلام کی زبان مبارک سے ارشاد ہے:

﴿إِنْ يَعْمَلُونَ مَا يَشَاءُونَ كَمَا أَنْشَأَهُمُّ مِنْ ذُرِّيَّةٍ قَوْمٌ أَخْرَىٰ نَسْتَعْلَمُ مِنْهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا كُنُّوا يَعْمَلُونَ﴾

(٦/ الانعام: ١٣٣)

”اور اللہ چاہے گا تو تم کو لے جائے گا اور تمہارے بعد جس کو چاہے ہے خلافت و نیابت دے جس طرح تم کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔“

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا أُسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾

(٥٥/ النور: ٢٤)

”اللہ نے تم میں سے ان سے، جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا۔ جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔“

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ تو مous کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشیں ہوتا بیان فرمایا گیا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلِيفَ الْأَرْضِ﴾

(٦/ الانعام: ١٦٥)

”اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں جانشیں بنایا۔“

سورہ یونس میں تصریح ہے:

﴿وَلَقَدْ أَهْلَكَنَا الْقُرُونُ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَاءُهُمْ رُسُلُنَا مُبَشِّرِينَ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا طَاغِيَنَ كَذَلِكَ تَعْزِيزُ الْقَوْمَ الْجُنُودِ مِنْ نَّحْنُ جَعَلْنَاكُمْ خَلِيفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْتَرَكُّمْ كَيْفَ تَعْمَلُونَ﴾

(١٣- ١٤/ یونس: ١٠)

”اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو، جب انہوں نے ظلم اغیار کیا، ہلاک کر چکے ہیں اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے ہم گناہ کار لوگوں کو اسی طرح بدله دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا، تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔“

اس کے بعد نوح علیہ السلام کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

﴿فَلَمَّا بُوأْتُهُ قَبْيَنَهُ وَمَنْ مَعَهُ فِي الْفُلُكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلِيفَ﴾

(٧٣/ یونس: ١٠)

”لیکن ان لوگوں نے ان (نوح علیہ السلام) کی تکذیب کی تو ہم نے ان (نوح علیہ السلام) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتنی میں سوار تھے سب کو طوفان سے بچا لیا اور انہیں (زمیں میں) خلیفہ بنادیا۔“

سورہ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ﴾

(۳۹: فاطر)

”وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا، تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے۔“

حضرت داؤد علیہ السلام کو خلافت بخشی گئی:

﴿يَدَأُودُرَاٰ جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ إِلَيْنَّ﴾

(۲۶: ص)

”اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے، تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔“

یہ لفظ خلیفہ خلف سے مشتق ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے ایک کی غیر موجودگی میں، خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیوبت کے سبب سے ہو، آنکھوں سے ظاہراً وجھل ہونے کی صورت میں ہو، اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمائندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿خَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلَفٌ﴾ (۱۹: مریم)

”تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔“

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے، دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا:

﴿إِخْلُقْنِي فِي قَوْمِي﴾ (۷: الاعراف)

”میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔“

یہ زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے۔

﴿وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ قَلِيلَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُقُونَ﴾ (۶۰: الزخرف)

”اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔“

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے، پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں اور تیسرا آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر اللہ جاہلتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے، بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے

جاشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

الخلافة النيابة عن الغير امالغيبة المنوب عنه و امالموته و امالعجزه

و امالتشريف المستخلف.

”خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں۔ اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو یا اس کی موت کے سبب سے ہو یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے ہو، یا نائب کو نیابت کی عزت بخششے کے لیے ہو۔“

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیرے معنی ان کے زد دیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، مثیل آلوی زادہ صاحب روح المعانی تک ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے، تینوں معنی کے لیے مختلف قول نقش کیے ہیں اور خود کوئی فیصلہ کرن بات نہیں کی ہے، جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہیں، میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں مشکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جاشین ہے، وہاں تو اسی فلاں کا جاشین ہونا مقصود ہو گا اور جہاں مشکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود مشکلم کی جاشینی اور قائم مقامی ہو گی، اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جاشینی کی تصریح ہے، اس کی جاشینی مراد ہو گی اور جہاں تصریح نہیں ہے، وہاں خود مشکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہو گی، جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

﴿وَأَنْفَقُوا مِمَّا جَعَلَهُمُّ مُّسْكِنَفِينَ فِيَطْ﴾ (الحدید: ۵۷)

”اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے۔“

اب اس آیت میں ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لیے مفسرین دلوں طرف گئے ہیں، کچھ نے کہا اس آیت میں ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لیے مفسرین دلوں طرف گئے ہیں، کچھ نے کہا کہ مال کہا: ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا، جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے، کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امور خیر میں اس کو صرف کرے، میں نے جو اصول اور پیش کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں، کشاف، بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے۔ کشاف میں ہے:

ان الاموال التي في ايديكم انما هي اموال الله بخلقه و انشاءه لها و انما مولكم

• مفردات، امام راغب اصفہانی، ص: ۱۵۵۔

ایاها و خولکم للاستماع بها و جعلکم خلفاء فی التصرف فیها۔
 ”وہ مال جو تمہارے قبضے میں ہے (درحقیقت تمہارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے، کیونکہ اسی نے
 اس کو بنایا ہے، اسی نے تمہارے حق کے لیے اس کا تم کو مالک بنایا ہے اور تم کو اس کے تصرف کا
 اختیار بخشا ہے۔“
 بیضاوی میں ہے:

من الاموال التي جعلکم الله خلفاء فی التصرف فیها۔
 ”وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جائشین بنایا ہے۔“
 روح المعانی میں ہے:

جعلکم سبحانه خلفاء عنہ عز و جل فی التصرف فیه من غیر ان تملکوه
 حقيقة۔

”اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا اس (مال) کے تصرف میں جائشین بنایا ہے، نہ یہ کہ تم واقعی اس
 کے مالک ہو۔“

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے اور نبی آدم
 ان ملکوں کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو اس باب کا سرعنوان ہے، یعنی:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمُلْكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ (۲۰/ البقرة)

”اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سبقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگر لکھ دیا ہے
 اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ طبری میں یہ دونوں قول ہیں، ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسرا مخلوق کی جائشیں کا
 ذکر ہے، دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرمara ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ
 بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے حوالے سے لکھا ہے:

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً مِنْيَ يَخْلُفُنِي فِي الْحُكْمِ بَيْنَ خَلْقِي.

”میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا، میری مخلوقات
 کے درمیان حکم کرنے میں۔“

اس کے اوپر اب زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

۱۔ تفسیر سورہ حديد، ج ۲، ص: ۱۴۴۔ ۲۔ تفسیر بیضاوی، ج ۲، ص: ۲۴۷۔

۳۔ روح المعانی، ج ۲۷، ص: ۱۴۶۔

ان اللّٰهُ تَعَالٰى اخْبَرَ الْمَلَائِكَةَ أَنَّهُ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً لَهُ يَحْكُمُ فِيهَا بَيْنَ

خَلْقِهِ بِحُكْمِهِ.

”اللّٰهُ تَعَالٰى فَرَشَتْوُنَا كُوْثُرَدَے رہا ہے کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ نہار ہاے جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔“

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے:

وَالْمَرَادُ بِهِ آدَمٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا نَهُ كَانَ خَلِيفَةً اللّٰهِ تَعَالٰى فِي الْأَرْضِ وَكَذَلِكَ كُلُّ نَبِيٍّ اسْتَخْلَفُهُمْ فِي عِمَارَةِ الْأَرْضِ وَسِيَاسَةِ النَّاسِ وَتَكْمِيلِ نَفْوِهِمْ وَتَنْفِيذِ امْرِهِ فِيهِمْ لِالْحَاجَةِ بِهِ تَعَالٰى إِلَى مَنْ يُنَوِّبُهُ بِلِ لِقَصُورِ الْمُسْتَخْلَفِ عَلَيْهِ عَنْ قَبُولِ فِيَضِهِ وَتَلْقِي امْرِهِ بِغَيْرِ وَسْطٍ.

”اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہے، کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللّٰه تَعَالٰى کے خلیفہ تھے اور اس طرح اللّٰه تَعَالٰى نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کی مگرافی اور نفوس کی تکمیل اور اللّٰه تَعَالٰى کے احکام نافذ کرنے میں، اللّٰه تَعَالٰى اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس وجہ سے کہ اللّٰه تَعَالٰى کے احکام کی تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔“

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جوابی اور پرگزرنی ہیں اور جن میں اللّٰه تَعَالٰى نے سارے بنی آدم کو خلاف فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیا علیہم السلام کے توسط سے اس خلافتِ الہی کی سندان کے متبوئین تک کو عطا ہوئی ہے اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں:

① تمام فسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

② روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللّٰه تَعَالٰى ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا، اس لحاظ سے آدم علیہ السلام کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن جس اہتمام سے، جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش، اللّٰہ کی نیابت، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ، پھر ان کی عدولی حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلہ انبیاء قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات و فضائل جو بیان کیے گئے ہیں، ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا، یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گزشتہ مخلوق کی نہیں، بلکہ خالق کی تھی۔

③ اور تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول نہ بد کیا گیا ہے اور جس کا منشاء یہ ہے کہ مشکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی، اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا

• تفسیر طبری، ج ۱، ص: ۱۵۴۔ • تفسیر بیضاوی، ج ۱، ص: ۴۴۔

دہاں لا محالہ اسی متكلّم کی نیابت مراد ہو گی، جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا، اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے، یا سیاق و سبق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت صحیحی جائے گی اور اگر اس توضیح سے کلام مکہتہ خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے، اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے، جس کا آدم علیہ السلام کو نائب بنانا سمجھا جائے، ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا مقصود ہو جائے گا۔

④ اس معنی کی تائید میں اور بھی آئیں ہیں، جس سے آدم علیہ السلام اور بنی آدم کے شرف و کرامت کا اظہار ہوتا ہے، فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كَرِمَنَا بَيْ أَدَمَ وَحَسَّلَنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَرْ وَرَزَقْهُمْ قِنَ الْطَّيْبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كُلِّٰ مَنْ حَكَلْنَا نَعْصِيْلَةً﴾ (۱۷/ بنی اسراء یہل: ۷۰)

”هم نے آدم علیہ السلام کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خلائقی اور ترقی میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہتری مخلوقات پر بزرگی دی۔“

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا إِلْٰهُسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ (۹۵/ التین: ۴)

”هم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔“

پھر آسان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے، سب اس کے لیے بنائے اور سب اس کے کام میں لگے ہیں:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ طَإِنَّ فِي ذٰلِكَ لَكَيْتَ لِقَوْمٍ يَنْفَلُوْنَ﴾ (۴۵/ الجانیہ: ۱۳)

”اور جتنی چیزیں آسانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے سخر بنایا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں، جو سوچتے ہیں۔“

اور یہی نیابت الہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں، بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقات الہی کو انسان کا تابع دار اور سخر اور اسی کے لیے ان کا پیدا کیا جانا ہے تفصیل مذکور ہے، مزید تشریح کے لیے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں:

﴿خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۹)

”اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔“

﴿وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْجَمْرَ﴾ (۱۶/ النحل: ۱۴)

”اوہ ہی تو ہے جس نے دریا کو (تمہارے اختیار میں کیا۔“

﴿اللَّهُ الَّذِي سَخَرَ لَكُمُ الْجَنَّةَ﴾ (٤٥/ الجاثیہ)

”اللَّهُمَّ توَبْعِی جَسَنْ نَے دریا کو تمہارے قابو میں کر دیا۔“

﴿وَسَخَرَ لَكُمُ الْفُلْكَ﴾ (١٤/ ابراہیم: ۳۲)

”اور کشتیوں (جہازوں) کو تمہارے زیر فرمان کر دیا۔“

﴿وَسَخَرَ لَكُمُ الْأَنْهَرَ﴾ (١٤/ ابراہیم: ۳۲)

”اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔“

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصوداً صلی ہے اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخششی گئی ہے اور یہی خلافتِ الہی کا منشاء ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبْيَانِ أَنْ يَعْمَلُوهُنَّا وَأَشْفَقُنَّهُنَّا

وَحَمَلَهُنَّا إِلَيْسَانٌ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ (٧٢/ الاحزاب: ٣٣)

”ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھایا، بے شک وہ خالم اور جاہل تھا۔“

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابتِ الہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے، یہ امانتِ الہی کیا ہے؟ یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے، نائبِ حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے، جو اس کو کوئی ہے، تاکہ نیابت کے فرض سے عبده برآ ہو سکے۔ اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محسن و اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجح ہیں اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لیے عاریت ملے ہیں، یہ حدیث کہ ((فَانَ اللَّهُ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ)) ﴿اللَّهُ تَعَالَى نے آدم غَلَيلًا کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ اسی معنی کی طرف مشیر ہے اور مشہور قول ((تَخْلُقُوا بِالْخُلُقِ اللَّهِ)) ”اللہ کے اخلاق سے متصف ہو۔“ کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گا کہ اسلام کا نظریہ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے، جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطہ تک پہنچانا ہے اور جس کے اندر مادی و روحانی، سیاسی اور اخلاقی، دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست ڈگریاں ہیں۔

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خلقِ عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتا دی

● صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب النبی عن ضرب الوجه: ٦٦٥٥

ہے، «وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْأَنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ» (۵۱ / الذاريات: ۵۶) میں نے انسان اور جن کو اسی لیے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں۔“ اس کی حیثیت اس ایجنت کی ہے، جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تفہید ہے، اس کے ہاتھ میں شریعتِ الہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے، وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

امّت مسلمہ کی بعثت

عقیدہ خلافت کی رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابتِ الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہل سعادت وہی ہیں جو اس کو مانتے، اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سر افگنیگی کو تسلیم کرتے ہیں، اس نیابت اور عبدیت کے اصل نمائندے تو انہیاں ہیں، مگر ان کی تبعیت میں ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جبکہ محمد رسول اللہ ﷺ قیامت تک کے لیے خاتم الانبیاء ہو کر تشریف لائے ہیں اور آپ ﷺ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی قیامت تک آنے والا نہیں ہے، تو امت محمد یہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تبعیت میں نیابتِ الٰہی کی نمائندہ ہے اور دنیا کی آخری امت کی حیثیت سے قیامت تک نمائندہ رہے گی، اسی لیے قرآن پاک اور احادیث نبوی ﷺ میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امت محمد یہ کو اخرين کے لفظ سے تبعیب فرمایا ہے، جس کے معنی پچھلوں کے میں ہیں:

﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْأُوَّلِينَ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ﴾ (١٤-١٣ / الواقعۃ)

”ایک چھوٹا گروہ الگوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں سے۔“

﴿وَالْآخِرُونَ مِنْهُمْ لَكُمْ أَيْحُوا إِيمَانُهُمْ﴾ (٦٢ / الجمعة)

”اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمد یہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہو گی کہ کوئی نیا بنی اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے، احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ ”انہیا کی ان امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا تو انہوں نے ظہر تک کام کیا، پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ نہ مانے، پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا، انہوں نے عصر تک مزدوری کر کے کام چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا شرف بخشنا تو انہوں نے مغرب تک کام کر کے انہیا تک پہنچا دیا اور پوری مزدوری پائی۔“ ① یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری و ترمذی و متو اواب حاکم وغیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے۔ ②

اس حدیث میں دن سے مراد زمانہ ہے، اس سے واضح ہے کہ امت مسلمہ دنیا کی آخرین امت ہے، صحیح بخاری و مسلم ونسائی میں اور پر کی حدیث کی یہ شرح ہے:

((نَحْنُ الْأَخْرُونَ السَّابِقُونَ))

① صحیح بخاری، کتاب موقاۃت الصلاۃ، باب من ادرک رکعة من العصر: ۵۵۸۔

② کنز العمال، ج ۶، ص: ۲۲۰۔

③ صحیح بخاری، کتاب التعیر، باب النفح فی المنام: ۷۰۳۶۔

”ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے۔“

یعنی ظہور کے لحاظ سے تو دنیا کی تمام اموال میں ہم سب سے پیچے ہیں، لیکن اجر و ثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہوں گے، حدیث کا یہ یکلا امتدار ک حاکم، بہتی اور نسانی میں بھی ہے۔

ابن ماجہ میں ہے نبی ﷺ نے فرمایا:

((نحن أخر الامم)) #

”ہم سب سے آخری امت ہیں۔“

غرض ان آیات اور احادیث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ امتِ محمد یہ دنیا کی آخری امت ہے کیونکہ وہ آخری نبی کی امت ہے۔

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چونکہ آخری امت ہے اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے، اس لیے قیامت تک اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب و مصوروں ہے گا، جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی مہر لگاتا رہے گا اور اہل عذر کی جگہ کا قاطع ہو گا۔

اس خصوصیت کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآن پاک قیامت تک محفوظ رہے گا، اب ظاہر ہے کہ اس کی حفاظت کرنے والے مسلمان ہی ہوں گے، اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرماتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اس کو پورا کر دے گا، گواس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے، مگر عالم تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لیے اسباب و عمل کا واسطہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا حصول اسباب اور تدبیر پر موقوف رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا تو اس کا حصول بھی مجاہدات پر موقوف رکھا ہے، اس کے بعد پورا فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا جو وعدہ میا ہے تو وہ بھی اسباب و تدبیر کے ذریعہ ہی پورا ہو گا، اسی لیے قرآن پاک کی بقائے دوام کے لیے حاملین قرآن کو بھی تاقیامت دوام بخشے گا اور انہی کے ہاتھوں اور انہی کے سینوں میں محفوظ رکھ کر اس وعدہ کو پورا فرمائے گا اور یہ وعدہ بھی اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہو گا، جب امتِ محمد یہ کا ایک گروہ غلبہ اور سلطنت کے ساتھ دنیا میں قائم رہے، ارشادِ الہی ہے:

﴿وَهُمَّنَ خَلَقْنَا أَمْمَةً يَهْدُونَ إِلَى الْحَقِيقَةِ وَيَهُ يَعْدِلُونَ ﴾ (۱۸۱) (الاعراف: ۷/۱۸۱)

”ہمارے حقوق بندوں سے ایک امت ہے جو حق کی راہ دکھاتی اور حق کا انصاف کرتی ہے (اور کرتی رہے گی)۔“

اہل تفسیر نے اس کو امتِ محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ حال و مستقبل دونوں کے لیے ہے، یعنی قیامت تک امتِ محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا۔ ①

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَجَاءُكُلُّ الَّذِينَ أَبْعَدْتُكُمْ مُّؤْمِنِيْنَ كُفَّارًا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾ (آل عمران: ۵۵)

”اور تمہارے پیروں کو تمہارے نہ مانے والوں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی مغکرتو یہود ہیں، گودمرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہیں، اسی طرح ان کے اصلی پیروں تو مسلمان ہیں، ② مگر معنی میں یہود یوں کے مقابلہ میں عیسائی بھی پیروں کے جاسکتے ہیں، گوگراہ ہوں، ③ بہر حال اس آیت سے ظاہر ہے کہ اہل اسلام اور ان کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک دنیا میں قائم رہنے والے ہیں اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم ٹکٹکش میں بتلا رہیں، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زوال سے مسلمانوں کو غلبہ عام حاصل ہو جائے، جیسا کہ زوال سچ علیہ السلام کی حدیثوں کا منشاء بھی ہے۔

قرآن پاک کے ان اشارات انص کی تصریح احادیث نبوی میں استفادہ کے درج تک ہے:
 ((لَا تزال من امتي امة قائمة بامر الله لا يضرهم من خذلهم ولا من خالفهم
 حتى يأتيهم امر الله وهم على ذلك)) ④

”میری امت کا ایک گروہ اللہ کی شریعت کو لے کر قائم رہے گا، اس کے چھوڑنے والے اور اس کے مخالف اس کا کچھ نہ بکار سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بات یعنی قیامت آجائے گی اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔“

((لَا يزال ناس من امتي ظاهرين حتى يأتيهم امر الله وهم ظاهرون)) ⑤

”میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے، یہاں تک کہ اللہ کی بات یعنی قیامت آجائے گی۔“

((لَا يزال من امتي قوم ظاهرين على الناس حتى يأتيهم امر الله)) ⑥

”میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔“

((لَا يزال من امتي امة قائمة بامر الله لا يضرهم من كذبهم ولا من خذلهم))

① تفسیر بغوی، ص: ۳۶۷ و تفسیر خازن تفسیر آیت مذکورہ، ج ۲، ص: ۲۶۳۔ ② تفسیر ابن حجر الرضا تفسیر

آیت مذکورہ، ج ۳، ص: ۱۸۶، ۱۸۵۔ ③ تفسیر روح المعانی تفسیر آیت مذکورہ، ج ۳، ص: ۲۶۲۔

④ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوة: ۳۶۴۱۔ ⑤ ایضاً: ۳۶۴۰۔

⑥ ایضاً، کتاب التوحید: ۷۴۵۹۔

حتى يأتي امرالله وهم على ذلك)) *

”ميري امت کا ایک گروہ ہمیشہ احکام الہی کو لے کر قائم رہے گا اس کے جھٹانے والے اور اس کے چھوڑنے والے اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔“

((لا تزال طائفة من امتی ظاهرين على الحق لا يضرهم من خذلهم حتى يأتيهم امر الله وهم كذلك)) *

”ميري امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے خالف اور اس کے چھوڑنے والے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔“

((لن يسرح هذا الدين قائماً يقاتل عليه عصابة من المسلمين حتى تقوم الساعة)) *

”یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہے گا اس کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔“

((لا تزال طائفة من امتی يقاتلون على الحق ظاهرين الى يوم القيمة)) *

”ميري امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہے گا اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔“

((لا تزال طائفة من امتی قائمة بامر الله لا يضرهم من خذلهم او خالفهم حتى يأتي امر الله وهم ظاهرون على الناس)) *

”ميري امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ احکام الہی کو لے کر قائم رہیں گے، ان کو چھوڑنے والے اور خالف کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔“

((ولا تزال عصابة من المسلمين يقاتلون على الحق ظاهرين على من ناواهم الى يوم القيمة)) *

”مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر ہمیشہ لڑتی رہے گی اور قیامت تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی۔“

((لا تزال عصابة من امتی يقاتلون على امر الله قاهرين لعدوهم لا يضرهم من خالفهم حتى يأتيهم الساعة وهم على ذلك)) *

”ميري امت کی ایک جماعت اللہ کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی اور اپنے دشمنوں کو دباتی۔.....

1 صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷۴۶۰۔ 2 مسلم کی تہام درایتین صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب قولہ ملکی: ((لا تزال طائفة من امتی ظاهرين على الحق)): ۴۹۰۳۔ 3 ایضاً: ۴۹۵۴۔ 4 ایضاً: ۴۹۵۴۔

5 ایضاً: ۴۹۵۵۔ 6 ایضاً: ۴۹۵۷۔ 7 ایضاً: ۴۹۵۷۔

رہے گی، اس کے خلاف اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے۔

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں، حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے متدرک حاکم، جامع ترمذی، شفیعی، ابو داؤد، ابن ماجہ، ابن حبان میں بھی اس معنی کی حدیثیں مذکور ہیں، اس سے اندازہ ہو گا کہ آنحضرت ﷺ نے ہماری تسلیم کی خاطر کے لیے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشیں گوئی فرمای ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک قائم رہے گا، تاکہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آئندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہو گی اور یہ فرض جو پہلے انہیں ﷺ کے ذریعہ عطا ہوتا تھا، وہ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی ایک حدیث ہے: ((العلماء و رثة الانبياء)) یعنی امت محمدی کے علماء انہیا کے وارث ہیں، ظاہر ہے کہ یہ وراثت بُوت کے عہدہ اور منصب میں شامل نہیں ہے کہ یہ خاتم النبیین ﷺ کی ذات اقدس پر ختم ہو گیا، بلکہ بُوت کے فضائل و مکالات و فرائض سے ان کے حسب استعداد و مرتبہ حصہ ملے گا اور وہ تبلیغ دیں، ہدایت خلق، دعوت حلت، اقامت دین، امر بالمعروف، نبی عن المُنْكَر، دفع شبهات، ابطال مطلبین اور دبدعات وغیرہ ہیں اور وہ یہی کام انجام دیں گے۔

علمائے امت کے علاوہ صلحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں، پہنچ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مردی ہے کہ قیامت کے دن جب حضور انور ﷺ کی شفاقت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہو گی، تو یہ اتنی بیک زبان امت محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی۔

کادت هذه الامة ان تكون انباء كلها۔

”قرب ہے کہ امت کے سارے افراد انہیا کا مرتبہ پائیں۔“

ایک حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس امت کو یہ تباہ طرح حاصل ہوا کہ شہداء علی الامم یعنی اپنی اپنی امت پر شہادہ ہونے کا مرتبہ جس طرح انہیا کے کرام صلوات اللہ علیہم کو حاصل ہوا، اسی طرح اس امت کو شہداء علی الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے، صحیح احادیث میں ہے کہ ”قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امت محمدیہ سے لیا جائے گا۔“ یہ شاید اس لیے ہو گا کہ امت محمدیہ ہی وہ امت ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لائی ہے، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے:

♦ دیکھیے کنز العمال، ج ۶، ص ۲۳۱، ۲۳۵۔ ♦ یہ حدیث منhadm اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطرق متعددہ مردی ہے اور حدیثین نے اس لیے اس کو معتبر تابع ہے دیکھیے المقاصد الحسنة سخاوی، ص ۱۳۵ و کشف الخفاء عجلونی، ج ۲، ص ۶۴۔ یہ حدیث شعب الایمان بیہقی: ۱۶۵۱؛ صحیح ابن حبان: ۸۸؛ مسند الشهاب: ۹۰۸؛ احمد، ۱۹۶۔ ♦ مسند طیالسی، ج ۱، ص ۳۵۴، عن ابن عباس و مسند احمد و ابو یعلی۔ ♦ حافظ ابن کثیر نے قرآن کے دوسرے پارہ میں (لَكُونُوا شہداء علی النَّاسِ) کی تفسیر میں ان روایتوں کو یہ کا جا کر دیا ہے۔ ج ۱۹۱، ۱۹۰۔

”اس امت کو ایک باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں، ان میں سے ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِذْ دُعُونَا أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (۶۰ / المؤمن: ۶۰)

”مجھے پکارو، میں تمہیں جواب دوں گا، یا مجھ سے مانگو میں دعا قبول کروں گا۔“

حالانکہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیاء کو حاصل تھا اور دوسرا یہ کہ ان سے کہا گیا:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (۷۸ / الحج: ۷۸)

”اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تحکیٰ نہیں کی۔“

اور یہ بھی صرف انبیاء کو کہا گیا تھا اور تیسرا یہ کہ ان سے کہا گیا:

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أَمَةً وَسَطَّا لِتَلْوُنَّا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (۲ / البقرة: ۱۴۳)

”ہم نے تم کو بچ کی امت یا شریف و معزز امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر شاہد ہو۔“

یہ بھی پہلے صرف نبیوں سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو۔ ॥ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں امت محمدی کی جو پیغمبرانہ فضیلیتیں بیان کی گئی ہیں، وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے موئید ہیں، قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرا�ا گیا ہے کہ امت محمدی کو شہادۃ علی الناس اور شہادۃ علی الامم کی فضیلت بخشی گئی ہے۔

”شہید اور شاہد“ کے لغوی معنی ”حاضر“ کے ہیں، کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہو سکتا ہے، مثلاً: اس کی حمایت اور مدد کے لیے، اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لیے اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے، اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس کے دعویٰ کی تائید کے لیے، اس کو امور خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کے لیے، اسی لیے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہدانہ ثانوی معنوں میں حصہ سیاق و سبق بولا جاتا ہے، جس کا اندازہ حسب ذیل آیتوں سے ہوگا:

① حمایتی اور مددگار کے معنی میں:

﴿وَأَذْعُوا شُهَدَاءَ كُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ (۲ / البقرة: ۲۳)

”اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بلا و (کہ قرآن کا جواب لا کیں)۔“

اس معنی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے:

﴿وَكُوَّكَلَّ بَعْضُهُمْ لِيَعْصِيَ اللَّهَ﴾ (۱۷ / بنی اسراء: ۸۸)

”اگرچہ (اس قرآن کے جواب لانے میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے مد دگار ہوں۔“

② ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں:

• تفسیر قمیں میں نواب صدیق حسن خان نے اس روایت کا کچھ حصہ نقل کیا ہے۔ دیکھئے، ج ۱۱۳، ص ۱۹۳۔

﴿إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ مُّلْكِ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ (٢٢ / الحج)

”اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔“

ان معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں۔

③ کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں:

﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ﴾ (٥ / المائدۃ: ١١٧)

”حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر، جب تک ان میں رہا، نگران رہا۔“

④ گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی میں:

﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هُولَاءِ شَهِيدًا﴾

(٤ / النساء: ٤١)

”بھلا اس دن کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلا میں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔“

امور خیر کی تعلیم، یا امر بالمعروف و نبی عن الممنکر کرنے والے کے معنی میں:

﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أَمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَكَيْلُونَ الرَّسُولَ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ (٢ / البقرۃ: ١٤٣)

”اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا، تا کہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو اور یہ رسول تھہارا بتانے والا ہو۔“

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرًا مَّا خَرَجْتُ لِلْكَافِرِ مَأْمُونُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

(٣ /آل عمران: ١١٠)

”قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئی، ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔“

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ جو آخری امت ہے، اس لیے میوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے، وہ نبی کے دعویٰ کی شاہد، حمایتی، مددگار اور گواہ ہے، وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگران کار بنا کر تھیجی گئی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نبی عن الممنکر کا فرض انجام دے، اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا کہ وہیں الہی کامل ہو چکا پیغامِ الہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے اور اس کی تبلیغ اور ارشادت کا فرض امت محمدیہ

کے پر دھوگیا ہے، اب یہ تھا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمہ الہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظام عدل کی برقراری اور امر بالمعروف اور نبی عن المکر کے فرائض انجام دے۔ رسول ﷺ اس کے امام و پیشوایہں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوادا امام ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوایی کرے، چنانچہ قیامت کے دن اس کی بھی فضیلت تمام انبیا کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ”قیامت کے دن حضرت نوح ﷺ نے جائیں گے، وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی؟ وہ عرض کریں گے : ہاں میرے رب، پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے پوچھے گا کہ کیا انہوں نے تم کو تبلیغ کی، وہ انکار کریں گے کہ ہمیں تو کوئی ذرستانے والا نہیں آیا، تب اللہ تعالیٰ نوح ﷺ سے پوچھے گا، تمہارے دعویٰ کی شہادت کون دیتا ہے؟ وہ عرض کریں گے محمد ﷺ اور ان کی امت، تو یہ نوح ﷺ کی شہادت دیں گے۔“ یہ ارشاد فرم کر حضور انور ﷺ نے یہ آیت پڑھی 『وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا』 اخ ”یعنی تم کو معتدل و عادل امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔“ *

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں مند احمد و متندر ک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوح ﷺ کا نام یہاں مثالاً ہے، ورنہ امت محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہوگی، اس کا سبب ظاہر ہے کہ دنیا میں یہی ایک امت ہے جو تمام انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے، اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس امت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ ان کے ایمان کا جزو ہے، یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے، قیامت میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں ان کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہو گا۔

سورہ حج میں سورہ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے:

﴿هُوَ اجْتَبَيْكُمْ وَمَا جَعَلْتُ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۖ وَلَمَّا آتَيْتُكُمْ إِيمَانَهُمْ هُوَ مَمْكُمْ
الْمُسْلِمِينَ هُنَّ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَلَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى
النَّاسِ﴾ (الحج: ۷۸ / ۲۲)

”اسی اللہ نے (اے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو (ساری امتوں) میں چنا ہے اور اللہ نے تمہارے دین میں کوئی تینگی نہیں رکھی، تمہارے باپ ابراہیم صلی اللہ علیہ وسلم کا دین، اسی نے تمہارا نام مسلم پہلے رکھا اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔“ اور پر کی تین آیتوں میں امت محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں، ”امَّةٌ وَسَطًا“، ”عادل و معتدل امت“

* صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ البقرۃ: ۴۴۸۷۔

خیر اُمّةٍ ”سب سے بہترامت“ هوا جتبا کم ”تم کو اللہ نے چنان ہے، یہ تینوں وصف اس امت کی برگزیدگی، برتری اور فضیلت پر شاہد ہیں، بلکہ وصف اجتبائیکم ”تم کو چنان اور برگزیدہ کیا، تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انہی علیکم پر کپا گپا ہے۔

اس امت محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہدِ عادل حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، جو قیامت تک کے لیے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لیے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی بھی سابق نبی کی طرف منسوب کریں، وہ نبی ﷺ کی امت دعوت ہیں، حضور انور ﷺ نے اپنی زندگی میں دعوت کے اس فرض کو ناجام دیا، آپ ﷺ کے بعد عہدِ بعد قیامت تک اس پیغامِ الٰہی کی دعوت و تبلیغ امتِ محمدیہ کا فرض قرار پایا، جب تک دنیا آباد ہے، ہر ملک میں، ہر قوم میں، دنیا کے ہر گوشے میں اس پیغامِ الٰہی کی دعوت و تبلیغ تاہم قیامتِ امتِ محمدیہ کا فریضہ ہے، یہی بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں امتِ محمدیہ کی بعثت ہے، جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حسب ذیل فرمائی ہے:

”تمام انجیاں میں سب سے بڑا رجہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کو لوگوں کے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے اور اس کی قوم کو ایک ایسی امت بنایا جائے جو دوسری قوموں کی اصلاح کا ذریعہ ہو، حاصلے تو اس نبی کی بعثت اولیٰ اس کی بعثت ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔“

شہادت کا نتیجہ یہ ہے کہ بنی کی بعثت اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور ترقی کیے کے بعد اس کو اس نبی کے احکام و تعلیمات و آداب کا سر اپنا نہ کرنا دیتی ہے اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا پیغام لے کر جو اس کو پہنچا ہے، دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پا کر اور قوموں کی طرف مسجوت ہوئیں ہیں، اور اس کا طرح سہ سلسلہ قامت تک حاری رہے گا۔

شہزادے اپنے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثتِ اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأَقْبَابِ رَسُولًا مُّنَّهَّمًّا﴾ (٦٢ / إِنْجِيلُ جُمِيعِهِمْ)

”وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہی کے اندر سے بھیجا۔“

اور امت کی بعثت کا بیان اس آیت میں ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرًا مِّنْ أُخْرِجَتْ لِلْتَّائِس﴾ (١١٠/آل عمران)

”تموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو۔“

اور حدیث صحیح میں اس بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہؓؑ سے فرمایا:

^{٦٧} حجة الله البالغة، باب حقيقة النبوة وخصوصها، ج ١، ص: ٦٧.

((فَإِنَّمَا بُعْثِمْ مُسِيرِينَ وَلَمْ تُعْثُمْ مُعْسِرِينَ)) *

”تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنائے بھیجے گئے ہو اور دشواری پیدا کرنے والے بنائے بھیجے گئے ہو۔“

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ ایک پیغام حق کی حامل ہے اور اپنے رسول کی طرف سے دعوت و تبلیغ پر مامور ہے، وہ اس لیے مبجوضہ کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و ترقی کی خدمت انجام دے اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے، حضور انورؑ کا جو جہة الوداع میں اخیر حکم:

((فَيَلْعَلُ الشَّاهِدُ إِلَّا غَابٌ)) *

”میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے، وہ اس تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔“

صرف حضور انورؑ کے عہد مبارک تک کے لیے مدد و نہیں، بلکہ قیامت تک کے لیے یہ چاری و ساری ہے، فرمایا گیا کہ ہر حاضر دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہنچاتا چلا جائے، ذیل کی آیت پاک کا بھی یہی منشاء ہے:

﴿فَلَوْلَا تَفَرَّ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لَيَتَفَقَّهُوْ فِي الدِّيَنِ وَلَيُنْتَدِرُ وَأَقْوَمُهُمْ إِذَا رَجَعُوْهَا﴾

﴾اللَّهُمَّ لَعَلَّهُمْ يَعْدُوْنَ﴾ (۱۲۲: التوبۃ: ۹)

”تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے، تاکہ دین کا علم سیکھتے اور اس میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سنا تے، تاکہ وہ حذر کرتے۔“

داعیوں کی بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی:

اور یہی منشاء اس آیت کا بھی ہے جو پہلے بھی گز رچکی ہے، جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرًا مِمَّا أُخْرِجْتُ لِلَّاتِيْسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَمَا مِنْ عَبْدٍ يُؤْمِنُ بِإِلَهٖ إِلَّا هُوَ﴾

(۳: آل عمران: ۱۱۰)

”قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہیں عن المکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے، بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کے لیے سرفوٹی کرے اور اسی لیے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے:

* صحیح بخاری، کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ: ((يَسِرُوا وَلَا تَعُسُوا)) ۶۱۲۸ و حجۃ اللہ البالغة، ج ۱، ص: ۶۷۔ * صحیح بخاری، کتاب العلم، ۱۰۴ و مسلم، کتاب الحج، ۳۲۰، ۴۔

﴿وَلَتَكُنْ قَيْنَمُ أَهْمَةً يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَايَنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (۱۰۴/آل عمران)

”اور تم میں ایک جماعت ایسی ہوئی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“
اس سے ظاہر ہوا کہ امت محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نبی مکنک اور دعوت و تبلیغ میں مضر تھی، جس سے ہر دور میں نئی قومیں اسلام کی آغوش میں اپنا اپنا خون لے کر آئیں اور اسلام کی صولات و شوکت کو سلسل قیام و بقا بخشی رہیں، لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا، امت بانجھ ہو گئی اور دوسری قوموں کا داخلہ اس میں بند ہو گیا، مگر انشاء اللہ یہ وعدہ الہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غالب رہے گی تو دوسری قوم آ کر اس فرض کو ادا کرے گی:

﴿إِلَآتَنَفِرُوا يُعَذِّبُنَمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْبِدُلُنَ قَوْمًا غَيْرَ كُمْ وَلَا تَنْهُرُهُ شَيْءًا﴾

(۳۹/التوبہ)

”اگر تم نکلو گے تو اللہ تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگوں کو پیدا کر دے گا (جو اللہ کے پورے فرمائیں بردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔“

پھر فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْ يَرَى تَذَمَّنَمْ عَنْ دِينِهِ فَسُوفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ سَيِّئَتْهُمْ وَسَيُجْزَوُنَهُ لَا ذَلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعْعَثَةٌ عَلَى الْكُفَّارِينَ يُجَاهَهُمُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَجِدُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُعْتَدِيهِ مَنْ يَشَاءُ﴾ (۵/المائدۃ: ۵۴)

”اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھیں اور جو مونوں کے حق میں زری کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔“

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی، اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی، کفار کے مقابلہ میں سخت ہو گی، اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے ہمیشہ آمادہ رہے گی، اظہار حق میں کسی ملامت کی پرواہ نہ کرے گی۔ اس بخشت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آئے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل سورہ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكُمُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعُلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

وَجَاءُهُدًّا فِي اللَّوْحَيْنِ ۖ جِهَادٌ هُوَاجْتَبَكُمْ وَمَا جَعَلَ عَنِّيكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۖ وَلَئِنْ كُنْتُمْ لَهُ بِهِمْ هُوَ سَيِّكُمُ الْمُسْلِمِينَ ۚ لَمْ يَنْقُضُوا مِنْ قَبْلِ وَفِي هَذَا إِلَيْكُمُ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَلَئِنْ كُنُتوْا شَهِيدًا عَلَى النَّاسِ ۗ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَاتُّوِّلُ الزَّكُوْةَ وَاعْصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مُوْلَكُكُمْ فَإِنْعَمَ الْمَوْلَى وَنَعِمَ الْتَّصِيرُ ۝ ۚ (٧٧-٧٨ / الحج)

”مومنوں کو رکوع کرتے اور سجدہ کرتے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو تاکہ فلاں پاؤ اور اللہ کی (راہ) میں جہاد کرو، جیسا جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی (اور تمہارے لیے) تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین (پسند کیا) اسی سے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے) تاکہ بتیغیرت تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں شاہد ہو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کے (دین کی رسی) کو پکڑے رہو، وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست اور خوب مدگار ہے۔“

ان آیتوں سے اس شاہد امام اور مجتبائے عالم امت کے حسب ذیل آثار و علمات ہیں:

۱ ادائے نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی۔

۲ ادائے زکوٰۃ پر عامل۔

۳ ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط۔

۴ رکوع و تجوید عبادات الہی کی خونگر۔

۵ امور خیر پر حریص۔

۶ راہ حق میں جہاد اور فداء کاری پر آمادہ رہنے والی۔

امت محمدیہ کے جس گروہ میں یہ علمات پائی جائیں گی، وہی انشاء اللہ تعالیٰ ان پیشین گوئیوں کا مصدقہ ہوگا، اس کی بقا اور قیام اور غلبہ و شوکت کے متعلق اور پرہیان ہوئی ہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

قوتِ عاملہ یا قوت آمرہ

کسی جماعت کو منظم جماعت بنانے اور اس کی حفاظت کے لیے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے لیے ایک قوتِ عاملہ یا قوت آمرہ کی ضرورت فطرت انسانی کا تقاضا ہے، اسی لیے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم ہے، کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جاسکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو، انسانی گروہ جب مخفی ایک خاندان تھا تو خاندان ان کا بڑا اس کا سردار تھا اور اس کی زبان کا ہر حکم قانون تھا، جب خاندان نے جماعت کا روپ بھرا تو جماعت کا چودھری اس کا حاکم و آمر بنا، پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار کی تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا، ان بادشاہوں اور راجاؤں نے اس عزت اور شرف کو اپنی خدمت گزاری کا حصہ سمجھنے کے لیے اپنے غرور و استکبار سے اپنا خاندانی حق سمجھایا اما فوق بشرقوٹی سے اپنے کو متصف قرار دیا، اس خیال کا لازمی تیجھ تھا کہ انہوں نے اپنے کو دیوتاؤں کی اولاد طاہر کیا، جن کی پوجا ان کی رعایا پر فرض تھی، ان میں سے کوئی سورج بُشی بنا اور کوئی چند رُشی، یعنی کوئی سورج دیوتا کا نظر تھا اور کوئی چاند کا نکٹر اور دیوتاؤں کے اوتار اور قوتِ ربیٰ کے اوتار تو سب ہی تھے۔

عراق کے نمرود جبار بن گئے تھے اور مصر کے فرعون اپنے کو رُغْی یعنی سورج دیوتا کے اوتار کہتے تھے، ان ہی میں ایک فرعون وہ تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں «آتا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى» ۱ میں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا۔ ۲ بنے کا دعویٰ کیا تھا، چین کے بادشاہ اپنے کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، اسی لیے ایرانیوں نے اپنی زبان میں ان کو بخپور (اللہ کا بیٹا) اور عربوں نے اپنی ماء السماء (آسمان کے نطفہ کا بیدا) کا خطاب دے رکھا تھا یونان کی قدیم تاریخ بھی ایسے بادشاہوں سے خالی نہیں جو اپنے کو اللہ کا اوتار کہتے تھے، ہومر کے بادشاہ (مونارک) دیوتاؤں کی اولاد تھے اور ان ہی سے یونان کے سلاطین پیدا ہوئے۔ ۳ اس روشنی کے زمانہ میں بھی اس زمین میں جو سورج کا مطلع کہلاتی ہے، یعنی جاپان میں یہ اندھیرا چھایا ہے کہ وہاں کا بادشاہ جاپانی قوم کا اللہ ہے جس کی وہ پوجا کرتی ہے۔

روم کا بانی رومس اور اس کا بھائی دونوں ستارہ مریخ کی اولاد تھے۔ ۴ ولادتِ سُقْعَة علیہ السلام کے پہلے سے سلاطین روما عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھتے جاتے تھے اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ ۵ یہودیوں میں حضرتِ داؤد علیہ السلام سے پہلے قاضیوں کی حکومت تھی جو اللہ کے کاہن اور اللہ سے الہام پا کر اللہ کے نام پر حکومت کرتے تھے، اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوتی رہیں، ان ہی سب کے پیش نظر ارباب تاریخ اور علمائے سیاست نے حکومت کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں، مثلاً اوتاری، شخصی، عینی، امرائی، دستوری، جمہوری۔

۱ اسا نیکل پڑی بار نایک طبع یا زدہم، مضمون پوچان۔ ۲ تاریخ روم، جم: ۳، دارالترجمہ حیدر آباد کن۔ ۳ ایضاً، ص: ۴۲۹۔

① اوتاری سے مغہوم تھیا کر لیں ہے، یعنی وہ حکومت جس میں صاحب حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود اللہ یا اللہ کا مظہر یا اوتار یا نائب بن کر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی اور اسی عقیدت سے اس کو مانتی ہے۔

② شخصی وہ حکومت ہے جس میں تھا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی قوت و اثر سے حکومت کرتا ہواں کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو، دنیا میں اکثر بادشاہ ایسے ہی گزرے ہیں۔

③ اور اگر ملک کے باوقار اور دولت مند افراد ملک پر حکمرانی کریں تو یہ امر ایسی حکومت ہے، جیسی بھی یونان میں تھی۔

④ اگر کوئی شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضع قانون کی قوت کو اپنی قوم کے منتخب افراد کے ہاتھ میں دے کر خود کو صرف ظاہری بادشاہ کی حد تک محدود کر دے تو یہ حکومت دستوری ہے، جس طرح انگلستان میں ہے کہ وہاں بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

⑤ یعنی (آ مرانہ) وہ طرز حکومت ہے جس میں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی طاقت سے یا کسی جماعت کا رکن اور روح رواں بن کر اس کے نمائندے کی حیثیت سے ملک پر حکمران ہوتا ہے، مثلاً جرمی میں ہٹلر، اٹلی میں مولینی، گودہ بادشاہ نہیں تھے، مگر ان کا حکم بادشاہ ہی کے طور پر مانا جاتا تھا، فرق اتنا تھا کہ یہ کسی خاندان کے نہیں بلکہ جماعت کے نمائندہ تھے۔

⑥ اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد ملک کر خود اپنے لیے کسی مدت معینہ کے لیے اپنا ایک رکیس منتخب کر لیں، جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے، اس کی ایک صورت وہ ہے جو فرانس میں ہے۔ اور دوسری وہ جو امر یکہ میں ہے، فرانس کی جمہوریت کا رکیس اسی طرح کم اختیار رکھتا ہے، جس طرح انگلستان کا بادشاہ کم اختیار رکھتا ہے، انگلستان میں حکومت کی ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیر اعظم پر ہوتی ہے اور امر یکہ میں وزروں کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، خود رکیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کرتا ہے اور رکیس کے مددگار مختلف شعبوں کے سکریٹری ہوتے ہیں، اسی جمہوریت کی ایک خلک روں کی جمہوریہ اشتراکیہ شورائیہ بھی ہے جو مزدوروں اور کسانوں کی مختلف اجنبیوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔

اوپر کی سطروں میں حکومت کی تقسیم مختلف ملکوں کی حکومتوں کی تاریخ پر اجمانی نظر ڈال کر کی گئی ہے، جس سے اندازہ ہو گا کہ انسانوں نے اپنے سیاسی امراض کے لیے اب تک علاج کے کون کون سے نفع اور طریقے استعمال کیے ہیں۔

اسلام کے طرز حکومت پر جب بھی غور کیا گیا ہے تو اس طرح سے کہ جس زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے، اسی کے مطابق اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سیاستیں یورپ نے اسلامی خلافت کو

نمہبی یا اوتاری حکومت کا خطاب دیا، پرانے علاج خصی سلطنتوں کے خواگر ہیں، اس کو شخصی بتاتے ہیں، نئے لوگوں نے انگریزوں کے نمونہ کو دیکھ کر اس کو دستوری بتایا، پھر جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا، پچھلی جنگ کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلائے اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرأت کی گئی اور اس کے بعد جب موجودہ زعیمی حکومت (ڈیکٹیٹریپ) قوت پکڑ رہی ہے اس کو زعیمی حکومت (ڈیکٹیٹریپ) ثابت کرنے کے لیے میلان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملًا جس طرز کی حکومت قائم کی اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے، اس میں بیک وقت نہبی، شخصی، دستوری، جمہوری اور زعیمی حکومتوں کی خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں، اس لیے اہل نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ظہور میں آیا اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے وہ نہ اوتاری ہے، نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے، بلکہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو بکجا ہیں، لیکن وہ ان کے قبائل و مثالب سے خالی ہے، اس لیے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی، کبھی شخصی، کبھی زعیمی، کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی نظر آتی ہے، لیکن اگر اس کے اصل رخ سے دیکھنے اور اس کے ایک خط و خال کا جائزہ لیجھے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت تمام تر نہبی احکام پر قائم ہے، مگر اس کا امیر یا خلیفہ اللہ ہے، نہ اللہ کا اوتار ہے، نہ اللہ کا مظہر ہے، نہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے، نہ اللہ سے براہ راست احکام پاتا ہے، نہ اس میں کوئی الہی تقدیس ہے، نہ وہ اللہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور اللہ کی شریعت کی تنفیذ کے لیے اس کو منتخب کیا ہے، تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسول ﷺ کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں، اس کو الہی ہی کہا جاسکتا ہے اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں ارباب شوریٰ اور اہل حل و عقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے، اس کو تسامح اور دستوری کہہ دینا ممکن ہے اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افراد امتحان کے جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امتحان کے عالم افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امتحان پر واجب ہے اور وہ امتحان کے مشوروں کے مانند پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون و چراغ عمل کرنا امتحان کے لیے ضروری ہے، اس کو زعیم یعنی ڈیکٹیٹریپ سمجھا جاسکتا ہے، لیکن ان مختلف جھتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بنائے ہوئے

نظریات حکومت میں سے ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آ سکتا۔ اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورنمنٹ و حکمدوں میں پھنس کر رہے گئی اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعمیل ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور ان کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلمی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جزو کسی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ اللہ کی ملکیت ہے اور اسی کے حکم یا منشاء حکومت کا نفاذ حکومت کا فرض ہے اور اللہ کے بناء ہوئے اور تعلیم کیے ہوئے احکام و فرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے اور سب ہی ایک جیسے اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین و حکام اور سلطنت کے عمال کے قول و فعل کو قانون کے سلسلوں سے جائز دیتی ہے کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کر سکیں، لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے، تاکہ تقویٰ اور آخوند کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں، عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں، پھر تیسرا اور چوتھا قانون، پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لیے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں اور مجرم اس کو اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف اللہ کا تقویٰ اور آخوند کے مواخذہ کا ذرaran کے دل کی بکجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں عبید نبوت، زمانہ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ امت میں ایمان اور عمل صالح کی دعوت و تبلیغ برادر جاری رہے اور مسلسل تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم و باقی رکھا جائے، جس طرح آج تمدن اور پلٹر کے نام سے یادوسرے فلسفیانہ سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنابر مختلف ملکوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت دی جا رہی ہے اور اسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم و تربیت کا جدا گانہ نظام قائم ہے، اسی طرح اس اسلامی نظام حکومت کی برقراری کے لیے بھی سب سے پہلے اسلامی نظام تعلیم و تربیت کے اجر کی حاجت ہے۔

اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللہ تعالیٰ: ﴿لِنَحْكُمُ عَلَيْهِنَّ﴾ (۱۲/ یوسف: ۴۰)
”حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا۔“

آیت بالا میں ارشادِ خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا ہے، اس لئے اسلام میں حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن احکامِ الہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی، یعنی وہ احکام جو انہیم علیہم کے ذریعہ سے شریعت بن کرنا زال ہوتے ہیں اور دوسرے تکوینی، یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخوقاتِ عالم میں دلیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری و ساری ہے، دنیا میں ایسے بادشاہ گزرے ہیں، جنہوں نے نمرود و فرعون بن کر دعوائے بادشاہی کیا، مگر ان کو بھی تکوینی احکامِ الہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی اور یہ شبہ ان سلطینین عالم کو اس لیے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام و فرماں کے آگے جب اللہ کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا آمر بھی اپنے کو جانے لگتے ہیں، اسلام نے شک و شبہ کے اس رشتہ کو کاثڑا لایا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلطینین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہی کی ہے اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ، فیصلہ ہے، اسی معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں:

﴿لِنَحْكُمُ عَلَيْهِنَّ﴾ (۱۲/ یوسف: ۶۷)
”حکم نہیں، مگر اللہ کا۔“

﴿أَكَلَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَسِيبِينَ﴾ (۶/ الانعام: ۶۲)
”ہاں، اسی کے لیے حکم کرنا ہے اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے۔“
﴿وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (۲۸/ القصص: ۷۰)
”اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

امر تکوینی و فطری میں تو انسان کی ناچاری و مجبوری ظاہر ہے، وہ زمین، آسمان اور خاک و باہوآب و آتش اور جسم و جان میں ایک ذرہ کی کمی و بیشی بھی نہیں کر سکتا، نہ اشیاء کے خواص کو بدلت سکتا ہے، نہ ان کی صفات میں تغیر کر سکتا ہے اور نہ ان کے قواعد و قوانین میں ایک ذرہ کی کمی و اضافہ کر سکتا ہے، خدا کی احکام کے آگے سب ہی سر اگلندہ اور ناچار ہیں، حضرت ابراہیم علیہم السلام کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعوی کیا تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کر دیا۔ فرمایا:

﴿فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالْقَوْمِ مِنَ الْمُشْرِقِ فَأُولَئِكَ مِنَ الْمُغَرِّبِ فَبِهِمَّتِ الَّذِي لَكُفَّرُوا﴾

(٢٥٨) / البقرة

”تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر لا جواب ہو گیا۔“

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں:

﴿اللَّهُمَّ مِلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ﴾ (٢٦: آل عمران)

”اے اللہ سلطنت کے مالک تو ہے جس کو چاہے سلطنت دے۔“

اس لیے راہ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکامِ تکوینی کی طرح اس کے احکامِ تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لیے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں، اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجرا اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرمادیے ہیں، ان کے تنقیح سے اہل علم اور مجتہدین دین نئے نئے احکام جزئیہ مستبط کر سکتے ہیں۔

ان احکامِ الہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع و ضرر پر مشتمل ہوں، بے شبهہ اہل عقل اپنی عقل و فہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے، بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے، یا یوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب ترتیب ہوتا ہے، اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اہل عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ حکمِ الہی کے مطابق نہیں ہے تو گواں میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں، مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لیے امر غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے اس لیے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں، جس کو اللہ عالم الغیب نے نازل فرمایا۔

ان تمام مذکورہ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا واضح صرف اللہ تعالیٰ ہے، قرآن پاک اور احادیث صحیح میں اس حقیقت کو مختلف پیرايوں میں ادا کیا گیا ہے، عام طور سے فقہاً نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے:

﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ (٦/ الانعام: ٥٧ و ١٢ / یوسف: ٦٧)

”حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔“

﴿اَلَّا هُنَّ اَخْلُقُ وَالْأَمْرُ﴾ (۵۵/الاعراف)

”ہاں اسی اللہ کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔“

یہ دونوں آیتیں جن موقوں پر وارد ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادث عالم سے متعلق ہے، پہلی آیت دو جگہ ہے، سورہ انعام اور سورہ یوسف میں، سورہ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے، اس کے جواب میں ہے:

﴿مَا عِنْدِيٌّ مَا سَتْحِلُونَ بِهِ اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ يَعْلَمُ الْقِعْدَ وَهُوَ خَيْرُ الْفَلِيلِينَ﴾

(۵۷/الانعام)

”جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو، وہ میرے پاس نہیں، حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے، اللہ تعالیٰ واقعی بات بتلاد دیتا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔“

دوسری جگہ سورہ یوسف میں اس موقع پر ہے، جب وہ اپنے بیٹوں کوہدایت کرتے ہیں کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پہنچو، پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے، مگر ہو گا وہی جو اللہ کو منظور ہے:

﴿وَمَا أَغْنَى عَنْكُمْ قِنَّ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوْكِيدٌ وَعَلَيْهِ فَلِيَتُوكِيدُ الْمُتَوْكِلُونَ﴾ (۱۲/یوسف)

”اور اللہ کے حکم کو میں تم سے ٹال نہیں سکتا حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔“

دوسری آیت کا موقع یہ ہے:

﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ الْأَيَّامَ التَّهَارَ يَظْلَمُهُ حَتَّىٰ لَا يَكُنْ مُّؤْمِنًا وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَتٍ بِأَمْرِهِ ۚ اَلَّا هُنَّ اَخْلُقُ وَالْأَمْرُ تَبَرَّكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَلَمِينَ ۚ اَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۖ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِلِينَ ۚ﴾

(۵۵/الاعراف)

”بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھروز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے لے آتی ہے اور سورج اور چاند اور دوسرے سیاروں کو پیدا کیا، ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہوتا اور حاکم ہونا بڑی خوبیوں کے ساتھ

بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔“ صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق و نکونیں سے ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ لفظ امر اور حکم کی لغوی وسعت کی بنا پر امور و تشریعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں، لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر اجماعی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔ عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے، لیکن اس کے احکام کی مثل اللہ کے حکم کی مستقل اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

﴿لَا تَعْبُدُ الشَّيْطَانَ﴾ (۱۹ / مریم: ۴۴)

”شیطان کی عبادت نہ کر۔“

دوسری جگہ ارشادِ الہی ہے:

﴿أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ﴾ (۳۶ / ینس: ۶۰)

”یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔“

اوپر کی آئیوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انہیا اور انکے زمانہ اور خلفا کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، جواب یہ ہے کہ بے شبه اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، لیکن دوسروں کی اطاعت احکامِ الہی کی تبلیغ اور تنفیذ کے لیے حکمِ الہی کے تحت ہے، ارشادِ الہی ہے:

﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (۴ / النساء: ۵۹)

”اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔“

اولو الامر کی اطاعت، خواہ اس سے مراد علماء ہوں یا حکام، اللہ کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجر میں ہے اور رسول کی اطاعت بھی احکامِ الہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (۴ / النساء: ۸۰)

”جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيَطْعَمَ بِأَذْنِ اللَّهِ﴾ (۴ / النساء: ۶۴)

”اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، لیکن اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔“

یہود اور نصاریٰ نے احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا اور ان کا حکمِ الٰہی سے مانع و ممنوع بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجالایا جاتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو شرک کا ملزم قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قفال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے:

﴿قَاتَلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيٰوْمِ الْآخِرِ وَلَا هُجْرٌ مُّونَ مَا حَرَمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَلَا

يَدِيْعُونَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ﴾ (۲۹: التوبہ)

”اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا، اس کو حرام مانتے ہیں اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں۔“
ان آیات میں اہل کتاب پر اللہ پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے، وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکمِ الٰہی کے پابند نہیں ہیں، بلکہ یہ مرتبہ انہوں نے اللہ کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے، چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

﴿إِنَّهُدُوا أَخْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمْرُوا إِلَّا

لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَقَاتِلُوا﴾ (۳۱: التوبہ)

”انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے اور مریم کے بیٹے مسیح کو حالتانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہی معبود برحق کی عبادت کریں۔“

عالموں اور راہبوں کو رب بنا اسی بنا پر ہے کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقل طور پر اللہ کا حکم تسلیم کرتے تھے، کیونکہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیری طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے، اسلام نے اہل کتاب کو دوسری سورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلٰي كَلِمَةٍ سَوَاءٌ يَبْيَنُنَا وَيَبْيَغِيْلُمُ الْأَنْعَمَدَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَا شُرِيكَ لَهُ شَيْئًا

وَلَا يَكْتُبُ بَعْضًا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ﴾ (۶۴:آل عمران)

”اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مانی ہوئی ہے یہ کہ، تم اللہ کے سوا کسی اور کسی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنا کیں اور نہ ہم ایک اللہ کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنا کیں۔“

یہ رب بنا اطاعت ہی کی بنا پر ہے، ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عذری بن حاتم جو ایک عیسائیٰ عرب امیر تھے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورہ توبہ والی آیت مذکور پڑھی تو عذری نے کہا: ”وہ ان کو معبود نہیں بناتے، فرمایا کیوں نہیں، انہوں نے ان کے لیے

حلال کو حرام کو حلال کیا اور انہوں نے ان کے احکام کو مانا، لیکن ان کا ان کو معبد بنانا ہے، الفاظ یہ ہیں ”فَذَلِكَ عِبَادَتُهُمْ إِيَّاهُمْ“ ۝ ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے تو یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے، لیکن تو شرک ہے۔“ ۝

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں، بلکہ اللہ کا ہے اور اسی کا نام وضع حکم ہے، اس تخلیل و تحریم میں کسی کو شرک یہ ٹھہرانا عین شرک ہے، اسی طرح اللہ کے علاوہ یا اللہ کے حکم کے ساتھ بلا وساطت حکم الہی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانون الہی کی ختنی سے بچنے کے لیے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہود یوں کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، یا ان کے فیصلہ کے لیے عرب کا ہنون کے پاس جاتے تھے، زجر و توبیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کھلا نقاق اور شرک فرمایا، چنانچہ بعض اصولی احکامِ عدل و انصاف اور طریق اطاعتِ احکام کے ذکر کے بعد اشارہ ہے:

﴿أَلْمُرْتَرَى لِلَّذِينَ يَرْجِعُونَ أَنَّهُمْ أَمْنَوْا لَهَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَكَّمُوا إِلَى الظَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَغْفِرُوا لِيَهٗ ۝﴾ (٤٠ / النساء)

”کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جو مگان کرتے ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجوہ سے پہلے اتارا گیا، ایمان لا چکے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنا کیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔“

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر معبد بنایا جائے ”کل معبد من دون اللہ“ اور اہل تفسیر نے شانِ نزول کا لحاظ کر کے کہیں اس سے کا ہنون، جادوگروں اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے، اس لیے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے، وہ طاغوت ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ سات بجھوں پر آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبد باطل لیا گیا ہے۔

تو انین الہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فاش ہے اور اس کا مرکتب فاسق کہلانے گا:

﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أُنْزِلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَسِقُونَ ۝﴾ (٥ / المائدۃ: ٤٧)

”اور اللہ نے جو اتارا ہے اس کے رو سے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔“

۱) تفسیر ابن کثیر، تفسیر آیت سورۃ توبۃ، ج ۲، ص: ۳۴۸۔

۲) ترمذی، ابواب التفسیر و من سورۃ التوبۃ: ۳۰۹۵۔

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے، حدود و نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو جائز ہے اور جس سے تل بھر آگے بڑھنے کی جرأت گناہ اور عصیان ہے اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے ہیں اور ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے بیہاں سے ہوا ہے قرآن پاک میں سورہ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکام الہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے:

﴿وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ﴾ (٦٥ / الطلاق: ١)

”یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں۔“

﴿وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَمَنْ يَعْدَ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ﴾ (٦٥ / الطلاق: ١)

”یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں جو ان حدود سے آگے بڑھے گا، وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔“

سورہ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ يُؤْخَذُ خِلْدَةً جَنَّتِ تَكْرِيرٍ مِّنْ تَجْهِيْداً الْأَنْهَرُ خَلِدِيْنَ

فِيهَا مَا وَدِلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُؤْخَذُ نَارًا

خَلِدًا فِيهَا مَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِمِّنُ﴾ (٤ / النساء: ١٣ - ١٤)

”یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اسی میں ہمیشہ ہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدود سے آگے بڑھے گا، اس کو وہ دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے بڑی ذلت کی سزا ہے۔“

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ و رسول کی اطاعت اور اس کی جزا جنت کی نعمت ہے اور ان سے احراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے اور رسول کی اطاعت در حقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

قانون و شرع کی حقیقت تخلیل و تحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کر لے اور بلا سند الہی کی شے کو حلال یا حرام کر لے تو اس کا نام ”افتراء علی

الله“ اللہ پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا:

﴿وَلَا تَقُولُوا لَا تَعِيْفُ أَسِنَتَكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَلٌ وَهَذَا حَرَامٌ لَتَقْتَرِدُوا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبِ

إِنَّ الَّذِينَ يَقْتَرُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ مَتَّاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

(١٦ / النحل: ١١٦ - ١١٧)

”اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال و حرام) بتاتے ہو، ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ تم اللہ پر جھوٹ تھہت لگاؤ، یہ (دنیا میں) چند روزہ فائدہ ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال و حرام کی شریعت کو اپنے لیے مخصوص فرمایا، بلکہ یہ بھی پیشین گوئی فرمادی کہ جو لوگ شریعتِ الہی کو جھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے، گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے، مگر وہ ان کے لیے عذاب ہی ثابت ہو گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ ﷺ جو شریعتِ الہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکامِ الہی سے آگاہ فرماتے تھے اور اس حیثیت سے آپ کا ہر حکمِ حکمِ الہی ہے، لیکن حکمِ الہی کے بغیر ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک چیز کو اپنے لیے حرام قرار دیا تو عتابِ الہی آیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحِبُّ مَا أَحَقَ اللَّهُ لَكَ﴾ (التحريم: ٦٦)

”اے تنبیہ! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاقِ نبی کو بھی حاصل نہیں، حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بناء پر ترک کر دے، مگرجب آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ ﷺ کو منع فرمادیا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دونوں سانحہ دو نقصان تھے ایک یہ کہ نبی کا ہر قل جو اس کے لیے مخصوص نہ ہو، امت کے لیے حکمِ الہی کے تحت شرع کا حکم رہتا ہے، اس قاعدہ کی بناء پر آپ ﷺ کے اس ترک سے امت اپنے لیے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی، دوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذنِ الہی کے بھی حق تشریع ہے، جو صحیح نہ ہوتا، اسی لیے نبی کی تشرییعِ حیثیت پر ہی ہے کہ وہ شریعتِ الہی کا مبلغ اور قانونِ ربیٰ کا شارح اور مظہر ہے، قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

﴿وَلَا يُحِبُّ مُؤْمِنَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ﴾ (التوبہ: ٩)

”اور (یہود و نصاریٰ) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔“

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے، وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلغ تھے، رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولو الامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے، کیونکہ وہ رسولِ نبی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے، اصول کا مسئلہ بن گیا ہے، چنانچہ علم عقائد اور اصولِ فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔

علم اصولِ فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیر بحث آیا ہے کہ واضح قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی

کے امر و نبی سے بندوں نے فرض واجب اور حرام و حلال کو جانا۔ علامہ آمدی المتوفی ^{۲۳} ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انه لا حاكم سوى الله تعالى ولا حكم الا ما حكم به ، ويتفرع عليه
ان العقل لا يحسن ولا يقبح ولا يوجب شكر المنعم وانه لا حكم قبل

ورو دالشرع.

”جانتا چاہیے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اور حکم وہی ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور اسی اصل مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا کہتی ہے نہ برا اور یہ کہ محض کاشکر عقل نہیں ہے اور یہ کہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں۔“

مقصود یہ ہے کہ احکام شریعت اور قانون شرعی کا واضح صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا حکم حکم ہے اور اسی کا قانون قانون ہے، اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تہاں عقل کی رو سے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، منتخب یا حرام، ناجائز و کروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عتاب کا حکم عائد کیا جائے سکے، نہیں ہو سکتا اور نہ عقل اپنی تہاں کوشش سے کسی بات کو بے اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھا یا برا کہہ سکتی ہے۔ علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ^{۲۶} ھ تحریر میں لکھتے ہیں:

الحاکم لا خلاف فی انه رب العالمین. ②

”اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضح پروردگار عالم ہے۔“

قاضی بیضاوی المتوفی ^{۱۵} ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ سنوی واضح کرتے ہیں:

”حسن و فتح اور شے کے اچھے یا بے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے، جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے اور کسی کامال ظلم سے لے لینا برا ہے، اس کے دوسرا معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے اور دوسرا نفس کی، جیسے علم اچھا ہے اور جہل برا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا بے ہونے کا عقل کی رو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتیب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اشارعہ (اور عالم البست) کے نزدیک حسن و فتح کے یہ دونوں فیصلے شرع پر موقوف نہیں اور معتبر لکھتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے اور اس فیصلہ کے لیے حکم الہی کے درود کا انتظار نہیں کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت

• کتاب الاحکام فی اصول الاحکام، ج ۱، ص: ۱۳۔ ② ج ۲، ص: ۸۹ بولاقد مصر۔

کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔

معزلہ نے حقیقت میں اٹی بات کی ہے، یہ کہ شریعت کے فیصلے حکم کی معرفت ہوتی ہے اور عقل سے اس کی مصلحت، قیاس و تجربہ کی بنا پر اہل عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہل سنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (خفیہ) کا مسلک حق ہے، مولانا محب اللہ بھاری المتوفی ^{۱۹} مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

”حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے رو سے سمجھا جاسکتا ہے۔ یا صرف شرع سے؟ تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو برافرمایا وہ برا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا برا ہوتا اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ماتریدیہ اور معزلہ میں فرق یہ ہے کہ معزلہ اور امامیہ اور کرامیہ دغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پروا جب ہے اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہے لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے کوئی حکم حاضر عقل سے نہیں ہو سکتا۔“

بعض اہل اصول نے معزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے ہیں، مولانا بحرالعلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردیدی کی ہے، فرماتے ہیں:

”اس مسئلہ پر حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام امت کا جماعت ہے اور ہمارے مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معزلہ کے نزدیک واضح قانون و حاکم عقل ہے، یہ غلط ہے کیونکہ ایسا کہنے کی جرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معزلہ یہ کہتے ہیں عقل بعض احکام الہی کو جان سکتی ہے چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے۔“

قاضی شوکانی المتوفی ^{۲۵} اس کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے:

”اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے، اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت نہ ہو، یا اس کی

ج ۱، ص: ۹۰ برحاشیہ تحریر ابن ہمام۔ ۲ مسلم الثبوت، المقالۃ الثانية فی الاحکام۔

دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے، نہ ایمان واجب ہے اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے جو حکم ہو اس کے ساتھ حکم الہی کا تعلق سمجھا جائے گا۔ *

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید جہادیہ کا وہ قول فیصل نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا نجوم (خلاصہ) ہے:

”اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے، اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے، عام اس سے کہ وہ لذاتِ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنابر، اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبح (برا) ہے تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ انصاف، امر و نہی سے پہلے ہی عالم حقیقت میں ہو چکا تھا اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، عقل کبھی ان کے حسن و قبح کو معلوم کر لیتی ہے، تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں، لیکن شرع کے درود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا تو یہ مذکورہ بالحسن و قبح بندوں کے حق میں صرف شرع الہی پر مبنی ہیں۔“ *

حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصول فقد درحقیقت اصول فتن کی تہذیب ہے * اس میں فتن کے بڑے بڑے مسئللوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرمادیا ہے، اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ”قانون کا واضح درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے۔“ یعنی مخلوقات میں سے کسی کے لیے ثابت نہیں ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، وہ تمام تر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے، عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پالیتی ہے تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں، ورنہ عقلی کہنے کا یہ نشانہ ہے کہ عقل اس قانون کی واضح اور آمر ہے۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی، تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرین قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضع قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی ایک حاکم، آمرا و واضح شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا کہ یہ قانون شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقت خاص میں نازل ہوا، وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول و کلیات اور دوسرے ہیں اس کے فروع اور جزئیات، دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں، ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، ان میں تغیر و تبدل نہیں * ارشاد الفحول، ص: ۱۶۔ * اصول الفقه، ص: ۱۲۔ * ”تہذیب“ مطلق میں ایک مختصر متن متین کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحثہ کے ذریعہ میں ایک ایک فقرہ میں ادا کر دیا گیا ہے۔

ہوتا، تغیر و تبدل اور تجد و یعنی نئی صورتوں کا پیش آنا، یہ واقعات اور حادث میں ہوتا ہے، جو انہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فن طب جب بھی بنا ہو، لیکن اس کے اصول و کلیات پر انے اور غیر مبدل ہیں، اب جو بھی یہاں ریاض ظاہر ہوں، قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے، مثال کے لیے یوں سمجھئے کہ قتل ناحق کی سزا اقصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا اور اب بندوق سے، تپچے سے، روپالور سے، توپ سے، گولہ سے اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے، لیکن ذرائع قتل کا تغیر نفس مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی اور اب طرح طرح کی گاڑیوں، سائیکلوں، سکوتروں، موڑوں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے، ان سے حادث پیش آ جائیں، یا نقصان پہنچ جائے تو اصول کلیے میں کوئی فرق نہ ہو گا۔

دوسرا بہر یہ پیش آ سکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہدوہ ہیں جو احکام کے اصول و فروع پر پوری نظر رکھتے ہوں، آیات و احادیث سے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل و اسباب اور مصالح و مقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزوی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضح اور مختصر نہیں، بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے، بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکام اللہ کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہل اصول کے اس مسئلے کے قیاس حکم کا صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جز یہ فلاں اصول کلی کے ماتحت ہے، انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہاء نے فتاویٰ کا پورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جاسکتا ہے اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں اور اب بھی قائم ہیں۔

مکتّب



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ



سِرِّ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ